

مہرا النساء

ماز

نمبر ۱۵



مجھے تو یہ بھی علم نہیں کہ پردانہ ہم دونوں میں سے کون تھا؟ شاید میں تھا یا پھر شاید مومو بھی۔

مومو کو میں اس وقت سے جانتا ہوں جب وہ مراٹھا ہو کر تھی اور مراٹھا وہ اپنی پیدائش کے فقط دو ماہ بعد تک رہی تھی۔ اس کے بعد وہ مومو بن گئی تھی اور پھر میں نے اسے مراٹھا بھی پکارا ہی نہیں بلکہ میں نے تو اسے کبھی بھی نہیں پکارا۔ اسی لیے اس کو مراٹھا کہتے ہوئے مجھے عجیب سا لگ رہا ہے۔ یہ طرزِ خطاب بہت اجنبی سا ہے بلکہ اب تو مومو بھی اتنی ہی اجنبی ہے جتنا یہ نام۔

مومو کے کان میں اذان میں نے دی تھی۔ اس کو پہلا بوسہ بھی میں نے دیا تھا۔ اس کو نرس کے کمرے ہاتھوں کے شکنجے سے اپنے بازوؤں میں سب سے پہلے میں نے ہی اٹھایا تھا۔ میری جگہ اس وقت حیدر کو ہونا چاہیے تھا کیونکہ مومو اس کی بیٹی تھی۔ مگر حیدر کے بہت سے مسائل تھے۔ وہ ہفتے پہلے ایک اکنامک فورم میں شرکت کرنے کے لیے کینڈا گیا تھا۔ اسے مومو کی پیدائش سے پچھلے روز ہی آجانا تھا مگر برف باری کے باعث فلائٹس ملتوی ہو گئیں اور وہ وہیں پھنس گیا۔ اپنی جگہ وہ بھی بہت زیادہ تھا کیونکہ مومو اس کی اور سونیا کی پہلی اولاد تھی۔

حیدر کے کزن اور بہترین دوست ہونے کی حیثیت سے آنٹی نے مجھے فون کر کے بلوایا تھا۔

”حسان! مجھے اس وقت حیدر کی ضرورت ہے اور وہ نہیں ہے، مگر تم بھی میرے لیے حیدر کی ہی طرح ہو۔“ وہ پریشان تھیں اسی لیے اپنا پہلا جاب انٹرویو بھلا کر میں دوڑا چلا آیا اور پھر تمام انتظامات اپنے ہاتھ میں لے لیے۔

جب نرس نے حیدر کی نومولود کبیل میں لپٹی بیٹی میرے حوالے کی تو ایک مسرت بخش احساس نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ میں نے جھک کر بچی کو پیار کیا اور پھر ہسپتال کے سفید اور گرے ماربل سے بنے کارڈور کے دوسرے سرے پر کھڑی آنٹی کے پاس اسے لے آیا۔

”آنٹی! یہ حیدر کی بیٹی ہے۔“ اس سوئی ہوئی بچی کو میں نے آنٹی کی گود میں ڈال دیا۔ انہوں نے والہانہ انداز میں بچی کا ہاتھ جوام۔ مگر یکدم سر اٹھا کر مجھے دیکھا ان کی خوشی سے تھمتانے چہرے فکر کی لکیریں ابھری تھیں۔

”سونیا کیسی ہے حسان؟“

میں نے ایک گہری سانس لی، ”وہ ٹھیک ہو جائے گی۔“

میرا مطلب تھا کہ وہ ٹھیک نہیں ہے۔ آنٹی پریشانی سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ میں نے انہیں تسلی دینے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ میری پشت پر کسی نے کہا۔

”سونیا کے ہرینڈ کون ہیں؟“ میں چونک کر پلٹا۔ میرے سامنے سفید اور آل میں لمبوس، سپاٹ چہرے والی لیڈی ڈاکٹر کھڑی تھیں۔

”وہ یہاں نہیں ہیں، سونیا کیسی ہے؟“ میرے لمبے میں بے قراری تھی۔

”سوری، وہ بچ نہیں سکیں۔“ انہوں نے بتایا اور میں اپنی جگہ سُن سا ہو کر کھڑا رہ گیا۔

آنٹی بے اختیار اپنی من چاہی ہو کے لیے رونے لگی تھیں، میں نے ایک ترحم آمیز نگاہ ان کی بانہوں میں سکون سے سوئی بچی پر ڈالی۔ مجھے اس پر بے حد ترس آیا تھا۔ کسی بچے سے اس کی ماں چھین جائے اس کا اندازہ مجھ سے بہتر کون کر سکتا تھا؟ میری ماں بھی تین برس کی عمر میں مجھ سے دور چلی گئی تھی، فرق یہ تھا کہ مومو کی ماں کو اللہ نے اس سے دور کر دیا تھا اور میری ماں کو ایک مرد نے، یعنی ان کے دوسرے شوہر نے اس کے بعد مجھے کسی عورت کی محبت نہیں مل سکی تھی، میرے اندر اس بات سے جو خلا پیدا ہو گیا تھا، میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ مومو کے اندر بھی پیدا ہو کر میں کیا کر سکتا تھا۔

حیدر بمشکل جنازے پر پہنچ سکا تھا۔ اس کی حالت بہت بری تھی۔ اس کی اور سونیا کی لومیرج تھی، یہ بات مجھے اور بھی دکھی کر رہی تھی۔

حیدر کو اپنا ہوش نہیں تھا، آنٹی تعزیت کے لیے آنے والوں کو بھگتا رہی تھیں، کسی اور کی مدد نہ حاصل ہونے کے باعث میں اکیلا باہر کے بہت سے کام نٹا رہا تھا، ایسے میں کسی کو بھی اس ایک دن کی بچی کا خیال نہ آیا، جو پتہ نہیں کہاں تھی۔

اس وقت بھی میں اپنی مگرانی میں مائی حلیمہ سے کچن سے برتن نکلا رہا تھا جب دفعہ ”ایک چھوٹے بچے کے رونے کی آواز نے مجھے چونکایا۔“ یہ کون رو رہا ہے؟“

”کوئی مہمانوں کا بچہ ہو گا۔“ حلیمہ نے پلیٹیں نکالنے ہوئے مصروف انداز میں کہا۔

میں یکدم بے چین سا ہو گیا۔ وہ بچہ مسلسل رو رہا تھا۔ حلیمہ کو کچن میں چھوڑ کر میں آواز کے تعاقب میں باہر

گیا۔ رونے کی آواز پینٹری کے ساتھ بنے اسٹور روم سے آرہی تھی۔ میں اسٹور روم کا دروازہ پورا کھول کر جیسے ہی اندر داخل ہوا، سامنے سلور کی ایک چینی پر کبیل میں لیٹی حیدر کی روٹی بیٹی مجھے دکھائی دی تھی۔

دکھ حیرت اور غصے سے میرا برا حال تھا۔ میں نے بچی کو اٹھا کر تھپکا، مگر وہ روٹی رہی۔ میں نے اس کو باہر جا کر آنٹی کے حوالے کیا اور نوکروں کو ایک یادگار ڈانٹ پلا کر بچی کی نگہداشت پر لگا دیا۔ پتہ نہیں وہ کب سے بھوک لگی تھی۔

اس رات حیدر کو پہلی دفعہ اس کی بیٹی دکھائی گئی۔ حیدر نے کسی فلمی باپ کی طرح بیوی کی موت کا ذمہ دار بیٹی کو نہرا کر قبول کرنے سے انکار نہیں کیا تھا، بلکہ اس کو اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔

سونیا کی ڈینہ کے چھتے دن جب میں حیدر کی طرف گیا تو آنٹی نے مجھ سے پوچھا۔

”حسان! حیدر کی بیٹی کا نام کیا رکھیں؟“

ان کے سامنے کرسی پر بیٹھے بغیر سوچے سمجھے میرے لبوں سے ”مہراٹھا“ نکلا تھا۔

”مہراٹھا۔“ شاید آنٹی کو نام بیکورڈ لگا تھا۔

”اس بچی کو محبت کی ضرورت ہے آنٹی اور مہراٹھا تو مطلب ہی محبت ہوتا ہے۔“ میں یونہی کہتا چلا گیا۔

”ہوں ٹھیک ہے۔ یہ نام بالکل ٹھیک ہے۔ حیدر سے میں نے پوچھا تو وہ ”آپ کی مرضی“ کہہ کر لا تعلق ہو گیا، پتہ نہیں اس نے اور سونیا نے اپنے بچے کے لیے کتنے نام سوچے ہوں گے۔“ وہ یکدم افسردہ نظر آنے لگیں۔

”خوصلہ کریں آنٹی!“ ایک دم بہت زیادہ تنہا ہو جانے والی آنٹی کو تسلی دینے لگا، اور پھر محسوس طریقے سے میرا حیدر کے گھر آنٹی کی دلجوئی کے لیے آنا جانا بڑھتا گیا۔

وہ حیدر کے لیے بہت پریشان رہتی تھیں، حیدر نے خود کو ہر شے سے الگ تھلگ کر لیا تھا۔ اس کا زیادہ وقت اب اس کے کام میں گزرتا تھا۔ کبھی کبھار وہ مجھے سگریٹ پیتا بھی دکھائی دیتا، حالانکہ سونیا کی ڈینہ سے پہلے وہ سگریٹ نہیں پیتا تھا۔

”مت کیا کرو اسموکنگ نقصان دے گی۔“ ایک دن جب وہ لان میں ٹہلتے ہوئے سگریٹ پھونک رہا تھا تو میں نے اسے نوکادہ چھبیس سال کا تھا، مجھ سے چار برس بڑا، مگر ناراض، تکلفی، بلا کی تھی۔

”کبھی میں تمہیں منع کرتا تھا اور اب تم مجھے۔“ اس نے سر جھٹکا۔ ”کیا فرق پڑتا ہے؟“

”فرق پڑتا ہے حیدر! تم آنٹی اور مہراٹھا کو نہیں دے رہے ہو۔ ان دونوں کو تمہاری ضرورت ہے۔ اگر تم یونہی سگریٹوں کی طرح خود کو پھونکتے رہو گے تو نارمل لائف کی جانب آنا تمہارے لیے مشکل ہو جائے گا۔“

میرے سمجھانے پر اس نے اثبات میں سر ہلادیا لیکن مجھے علم تھا، وہ میری بات نہیں مانے گا۔ مومو اور حیدر میری زندگی کی کمائی کے وہ کردار تھے جنہیں کبھی میری بات نہیں ماننا تھی۔

میری زندگی میں ایک اور کردار میرے ابو تھے جن کا وہ برس پہلے انتقال ہوا تھا۔ بہن بھائی تھے نہیں، میں اکیلا رہتا تھا۔ ان دنوں نوکری تلاش کر رہا تھا۔ زندگی کے بارے میں میرے بیان واضح تھے، ایک زبردست قسم کی جاب ڈھونڈ کر چار پانچ برس خود کو فنانسلسی اسٹراٹج کرنا اور پھر۔۔۔ کسی اچھی سی لڑکی سے شادی کر کے ہنسی خوشی رہنا۔

زیادہ مسائل میرے ہوتے نہیں تھے، سو روز شام اپنے گھر سے دس منٹ کی داک پر موجود حیدر کے گھر جا کر آنٹی کے ساتھ ایک کپ چائے پینے کا وقت خود بخود نکل آتا تھا۔

اسی طرح ہی ایک عام سی شام جب میں آنٹی کی طرف آیا تو وہ لاؤنج میں رکھے صوفے پر بیٹھی، اپنی پوتی کے منہ میں چھوٹے سے پالی ڈال رہی تھیں۔

”کیسے ہو حسان!“ مجھے دیکھ کر ان کے چہرے پر ایک مہربان قسم بکھر گیا۔

”ٹھیک ہوں آپ کیسی ہیں؟“

”میں تو بس مہر کی جانب سے پریشان ہوں۔“ اپنی گود

عمران ڈائجسٹ کا ایک حیرت انگیز سلسلہ

ایئر ہوسٹس

اب دو حصوں میں شائع ہوئی ہے۔

منکوانے کا پتہ:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37 اردو بازار، کراچی۔

فون نمبر: 2216361

میں لپٹی مہر پختگی وہ تشویش سے کہنے لگیں۔ ”رات سے اتنا تیز بخار ہے۔ اب میری لپٹی سیدھی طبی امداد سے شکر ہے کچھ کم ہوا ہے، ورنہ اتنے چھوٹے بچے کی تو کوئی دوائی بھی نہیں ہوتی۔“

”ارے اتنی باری سی بچی کو کیوں بکار چڑھ گیا؟“ میں اٹھ کر مہر کے قریب آگیا اور پیار سے اس کا گال چھوا۔ وہ اپنی دواؤں کو دیکھ رہی تھی۔

”مہراوئے گندی بچی، ادھر دیکھو۔“ میرے پکارنے پر بھی وہ دواؤں کو ہی دیکھتی رہی۔ اس نے پتک کھڑے فراک کے ساتھ ہم رنگ ادلی جرابیں پس رکھی تھیں۔

”مہرا ادھر دیکھو۔“ میں نے اسے متوجہ کرنے کی ناکام کوشش کی۔

”مہر گندی بچی مومو۔“ غیر ارادی طور پر میرے لبوں سے مومو نکلا، اس نے ایک دم اپنی بڑی بڑی براؤن آنکھیں گھما کر مجھے دیکھا۔

مومو دراصل اس ناول کی ہیروئن کا نام تھا، جو میں پچھلی رات پڑھ رہا تھا۔ مہر کو دیکھتے ہوئے بے اختیار ہی میرے لبوں سے وہ نکلا اور اس دن سے اس کا ننگ نیم بن گیا۔ پھر ہم نے اسے کبھی مہر نہیں پکارا۔

وہ بہت باری بچی تھی، اس میں حیدر کی بہت شباهت تھی، خصوصاً اس کے اوپر والے ہونٹ کا کٹاؤ تو ہو ہو حیدر کی طرح تھا مگر بھوری آنکھیں اس نے سونیا کی جڑائی تھیں۔

جب مومو نے پاؤں پاؤں چلنا شروع کیا تو اس کا مشغلہ مٹی کھانا بن گیا۔ آنٹی اس کے لیے دنیا بھر کے بہترین کھلونے لاتی تھیں، مگر مومو پھر بھی کسی بلی کی طرح رینگ کر لاؤنج سے باہر نکل جاتی اور لان میں کیاری سے مٹی بکال نکال کر کھاتی۔ مجھے جب بھی وہ مٹی کھاتی دکھائی دیتی، میں اسے ڈانٹ دیتا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ منع تو نہیں ہوتی البتہ میری گاڑی پورچ میں داخل ہوتے دیکھ کر ہی وہ مٹی کھانا چھوڑ کر تیزی سے گھٹنوں پر چلتی ہوئی اندر روپوش ہو جاتی۔ وہ مجھ سے ڈرنے لگی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ میں اسے صرف ڈانٹتا ہوں، اسی لیے جب اس شام میں حیدر کی طرف آیا اور وہ مجھے فراک میں ملبوس کیاری میں بیٹھی نظر آئی تو میں نے قدرے نرمی سے اسے پکارا ”مومو!“

مٹی کھاتے اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھ یکدم رکے، اس نے گردن اٹھا کر قدرے فاصلے پر مجھے کھڑے دیکھا تو

اس کی مڑی ہوئی پلکوں والی بھوری آنکھوں میں یکدم بے تحاشا خوف سٹ آیا۔ مٹی چھوڑ کر تیزی سے لڑھکتی ہوئی وہ اندر کی جانب بھاگی تھی۔

میں بے اختیار ہنس پڑا اور اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

آنٹی اندر ہی بیٹھی تھیں۔ میں نے اس کو جالیا۔

”آنٹی یہ مٹی کھا رہی تھی۔“

”ارے حسان آؤ بیٹا۔“ انہوں ایک نظر کاریٹ پر بیٹھی مومو پر ڈالی جواب ان کے صوفے کا بازو پکڑ کر کھڑی

ہونے کی کوشش میں بار بار نیچے گر جاتی تھی۔

”بس اب میں کہاں بھاگ سکتی ہوں۔ اس کے پیچھے؟

ذرا ادھر ادھر ہوئی تو یہ باہر نکل جاتی ہے۔“ اس کا منہ دھلا کر لانے کے بعد آنٹی کہہ رہی تھیں۔

میں ہنس رہا پھر حیدر کے متعلق استفسار کیا۔

”حیدر کے پاس گھر کے لیے کوئی وقت نہیں ہے اس کا

تمام وقت اپنے آس کے لیے ہے۔ گھر آتا ہے تو کمرے

میں بیٹھ کر آئینہ دیکھ کر تارتا ہے۔ اس نے تو ان تمام

مہینوں میں مومو کی شکل بھی ٹھیک سے نہیں دیکھی۔“

انہوں نے گود میں بیٹھی مومو کی جانب تاسف سے دیکھتے ہوئے اس کے ماتھے پر آئے بھورے بال سنوارے۔

”میری سمجھ میں نہیں آتا حسان! میرے بعد میری مومو کا کیا

بنے گا۔ میری مومو تو رُل جائے گی۔“ ان کی نگاہوں اور

نبی سے اضطراب چھٹک رہا تھا۔

اس وقت تو میں نے آنٹی کو تسلی دے دی مگر اس رات

مجھے آنٹی کی باتیں بہت یاد آئی تھیں۔

میں نے آپ کو بتایا تھا، میری مٹی مجھے تین برس کی عمر

میں چھوڑ کر چلی گئی تھیں، ان کے دوسرے شوہر مجھے نہیں

رکھنا چاہتے تھے، سو میں ساری زندگی بابا کے ساتھ رہا۔

کی محبت کی کمی نے میرے اندر جو خلش چھوڑی تھی وہ

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ خلا بن گئی تھی اور اسی خلا

اسی خلش اور ذات کے ان ہی اندھیروں پر ہی تو میں یہ

کہانی آپ کو سن رہا ہوں۔ یہی بات تو میں آپ کو سمجھانا

چاہتا ہوں، مگر آپ کو ایسے سمجھ میں نہیں آئے گی۔ آپ

جب تک میری کہانی پوری نہیں سن لیں گے آپ کو میری

منطق، میری تھیوری سمجھ میں نہیں آئے گی۔

اپنی ماں کی جدائی کے بعد میری تھیوری یہ تھی کہ اس

دنیا کی ہر عورت بے وفا ہوتی ہے۔ عورتیں ہمیشہ آخر میں

چھوڑ جاتی ہیں، بے وفائی کر کے تھکا کر جاتی ہیں۔ آپ کو

میری بات بری لگے گی، جانتا ہوں، مگر آپ کو میری بات

سنجھنے کے لیے میری پوری کہانی سننا پڑے گی۔

”کدھر ہوتے ہو تم حسان؟ اب تو حیدر کی طرح

تمہارے پاس بھی ماں کو دینے کے لیے چند منٹ بھی نہیں

ہیں۔“ مجھے دیکھتے ہی آنٹی نے بے حد شامی انداز میں کہا۔

”پورے چار مہینے بعد شکل دکھائی ہے اپنی!“

”سوری آنٹی! میں کراچی تھا، وہاں پر مسائل ہی اتنے

تھے کہ پھنس کر رہ گیا۔“ ان کے اپنائیت بھرے شکوے

نے مجھے شرمندہ کر دیا تھا۔

مومو کا بڑی ہو چکی تھی، چلتی پھرتی نظر آ رہی تھی اور

تو اور اب وہ بولتی بھی تھی، البتہ مجھ سے ابھی تک ڈرتی

تھی۔

اسے دیکھ کر میں نے ایک دوستانہ مسکراہٹ اچھال دی

مگر وہ خاموشی سے اپنی بڑی، بھوری آنکھوں سے مجھے

دیکھتی رہی۔

میں آنٹی سے باتوں میں مصروف ہو گیا۔ اتنے عرصے

بعد مل رہا تھا، کچھ میں سنا رہا تھا تو کچھ وہ بولتے بولتے میرا

حلق خشک ہو گیا تو میں نے سوچا کہ ذرا بات مکمل کر کے پانی

پی آؤں۔

”مانی!“ مومو کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ میں

نے رک کر بے حد چونکتے ہوئے اپنے دائیں جانب دیکھا،

یو موائے ننھے ننھے ہاتھوں میں پانی کا گلاس تھا، کھڑی

تھی۔ مجھے حیرت کا جھٹکا لگا۔

”مومو! میں نے تو پانی نہیں مانگا۔“ میں نے حیرانی سے

پوچھا۔ اسے میرے لیے پانی لانے کو کس نے کہا تھا۔

”آپ کو پاش (پاس) لگی ہے؟“ وہ اپنی تو تلی زبان میں

پوچھ رہی تھی۔ آنٹی سی بچی نے اندازہ کر لیا تھا کہ مجھے

پاس لگی ہے اور وہ دواؤں کو میرے لیے پانی لے آئی تھی۔

میں بے حد شاکد تھا۔

”تھینک یو مومو۔“ میں نے گلاس اس کے ہاتھ سے

تو لیا۔

”میری مومو بہت کیڑمگ ہے۔“ آنٹی نے پیار سے

مکراتے ہوئے اسے دیکھا۔ ”جیسے ہی حیدر تھکا بار اگھر

آتا ہے، مومو فوراً اس کو پانی پلاتی ہے۔“

مجھ جیسے اپنے آپ سے واسطہ رکھنے والے بندے کو

ایک بہت چھوٹی لڑکی کا یہ خیال دیکھ کر بہت حیرت ہوئی تھی

۔

مومو کچھ اور بڑی ہوئی تو آنٹی کو اسے اسکول میں ڈالنے

کی فکر ہوئی۔

”آنٹی! ابھی تو وہ بمشکل ڈھائی سال کی ہوگی، ابھی اسے

اسکول میں مت ڈالیں۔“

”حسان! میں چاہتی ہوں۔ مومو اپنی عمر سے ایک دو

برس آگے اسٹڈیز کر لے۔ چلو ابھی اسکول میں نہیں

ڈالتے مگر اسے گھر میں نرمی اور پیار پڑھا کر سال ڈیڑھ

سال بعد ڈائریکٹ وین میں داخل کرائیں گے۔“ وہ پہلے

سے پلان کر کے بیٹھی تھیں۔ ”تمہیں نہیں پتہ، میری

مومو بہت سمجھ دار ہے۔ اس کا ذہن اس کی عمر سے آگے

ہے۔“

آنٹی کا مجھے قائل کرنے کے لیے کہا گیا وہ آخری فقرہ

میرے ذہن کے پردوں سے چپک کر رہ گیا۔ میرا مسئلہ یہ تھا

کہ جو بات میرے ذہن میں ایک دفعہ بیٹھ جاتی تھی وہ کبھی

نہیں نکلتی تھی۔

اس روز میں چند کتابیں خریدنے مارکیٹ گیا۔ مطالعہ

میرا شوق، میرا جنون تھا۔ کتابوں کے معاملے میں ہمیشہ

سے اعلا ذوق اور کیریزی رہا تھا۔ اس روز بھی چند اعلا قسم کی

کتابیں خرید کر میں کاؤنٹر پر کھڑا بے منت کر رہا تھا جب

دائیں جانب رکے ریک پر کچھ کچھ بکس اور اردو

انگریزی کے حروف تہجی کے قاعدوں نے میری توجہ اپنی

جانب کھینچی۔

پہلا خیال میرے ذہن میں مومو کا آیا تھا، چنانچہ میں

نے چند کتابیں خرید لیں۔

شام کو حیدر کی طرف گیا تو جاتے ہی کتابوں والا شاپر

مومو کو گھمایا۔ ”یہ تمہاری ہیں۔“

وہ میرے مقابل صوفے پر بیٹھ گئی اور شاپر سے باری

باری تینوں بکس نکال کر دیکھنے لگی۔ اس کے ہاتھ چھوٹے

چھوٹے تھے اور کتابیں بڑی اور موٹی تھیں۔

”تھینک یو۔ پر ان کا کیا کروں؟“ اس نے سر اٹھا کر

مجھے دیکھتے ہوئے متانت سے پوچھا، اس کی بھوری آنکھوں

میں بنا کی سنجیدگی تھی۔

”ان کو پڑھو۔“

”وہ کیسے؟“ اس نے مڑی ہوئی پلکیں اٹھا کر معصومیت سے مجھے دیکھا۔

”تم ہی پڑھاؤ نا، حسان!“ آنٹی جو کافی دیر سے ہماری ایکٹیویٹی دیکھ رہی تھیں بول اٹھیں۔

”پڑھاؤں گا، اگر آپ کو میرا روز روز کا آبرا نہ لگے۔“

”کیسی باتیں کرتے ہو حسان؟“ وہ برائیاں گئیں۔

”یہ تمہارا آبرا گھر ہے، غیروں کی طرح تکلف نہ کیا کرو اور اب تم روز آکر اس کو پڑھاؤ گے، اس عمر میں مجھ سے یہ پڑھانے والا کام نہیں ہوتا۔“ وہ پھر مومو کی جانب پلٹیں۔

مومو دونوں ہتھیلیاں چہرے کے گرد رکھے دچھی سے ہمیں دیکھ رہی تھی۔ ”اور مومو! اب یہ حسان انکل آج سے تمہارے سر پر ٹھیک ہے؟“

مومو نے فرماں برداری سے اثبات میں سر ہلادیا۔

یوں اس روز سے میں مومو کا پیپر بن گیا۔ اتنے چھوٹے بچے کو پڑھانے کے لیے بہت زیادہ قوت برداشت درکار ہوتی ہے مگر اپنی عمر سے آگے سوچنے والی سمجھ دار مومو کے ساتھ مجھے کوئی مسئلہ نہ ہوا۔

ہاں وہ سوال بہت کیا کرتی تھی۔

”سرا! ہم ہتے کیوں ہیں؟“

”سرا! آہن بلیو کیوں ہوتا ہے؟ گرین کیوں نہیں ہوتا؟“

”سرا! یہ پانی کا کوئی کڑیوں نہیں ہوتا؟“

”سرا! یہ دھواگ کیسے بنتا ہے؟“

اور میں اس کے سوالوں کا جواب ہمیشہ تفصیل سے دیا کرتا تھا۔

”مومو! تمہیں پایا نام دیتے ہیں؟“ اس روز وہ اسٹڈی روم میں میرے سامنے برکھی کرسی پر بیٹھی، اپنی کتاب کو ہمارے درمیان رکھی اونچی ٹیبل پر رکھے letters dotted پر پینسل پھیر رہی تھی، جب یونی میں نے پوچھ لیا۔

”داد کتہی ہیں، پایا کے پاس نام نہیں ہوتا۔“ وہ چہرہ اٹھائے اور رے بغیر بولی۔

”تمہیں برا تو لگتا ہو گا؟“ میں اس کی محرومیوں کی شدت سے آگاہی حاصل کرنا چاہتا تھا۔

”نہیں۔“ اس نے شانے اچکائے۔ ”داد کتہی ہیں پایا ازائے بڑی مین!“ وہ اتنی سی عمر میں سمجھو تا کر چکی تھی۔

پھر ایک روز جب میں اسے میٹھس کے ہند سے لکھتا دکھا رہا تھا اس نے پینسل میز پر رکھتے ہوئے پوچھا ”سرا“

میری ماما بہت اچھی تھیں؟“

”ہاں، وہ بہت اچھی تھیں۔“

”پھر وہ مجھے چھوڑ کر کیوں چلی گئیں؟“

”بھئی، وہ مومو کو ہمارے پاس چھوڑ کر گئی ہیں۔“ میں نے اسے سہانا چاہا، مگر وہ شاکی نگاہوں سے مجھے دیکھ کر بولی۔

”مگر آپ تو ہر وقت ڈانٹتے رہتے ہیں۔“

میں بے اختیار ہنس پڑا۔ ”اگر نہ ڈانٹوں تو تم میری چھوٹی سی پیاری سی فرینڈ بن سکتی ہو۔“

”جی سرا!“ اس کی بھوری آنکھوں میں دیے سے جل اٹھے تھے۔ اس روز سے وہ بہت حساس، سمجھ دار ذہین اور عام بچوں کی طرح ضد نہ کرنے والی مومو میری بہت اچھی دوست بن گئی۔ وہ مجھ سے بہت سی باتیں کرتی تھی، یہاں تک کہ جب وہ ڈائریکٹ دن میں داخل ہونے کے بعد اسکول جانے لگی تو شام کو اپنے پورے دن کی روئیداد مجھے سناتی تھی۔

جہاں اس کی پڑھائی کی ذمہ داری مجھ پر تھی، وہاں اس کے اسکول فنکشنز اور پیئرٹ پیپر میٹنگز آئینڈ کرنا بھی میرا فرض بن کر رہ گیا تھا۔

اس طرح وہ میرا خیال رکھتی تھی۔ جس لمحے میں گھر میں داخل ہوتا، وہ بھاگ کر مجھے پانی پلاتی اگر آنٹی کے بعد اصرار میں شام کو کھانا ان کی طرف کھالیتا تو مومو ہمیشہ میرے قریب بہت الٹ سی بیٹھی ہوتی تھی۔ جو نمی میں آخری نوالہ لیتا، وہ فوراً ”اٹھ کر شو کاؤڈ میرے سامنے کر دیتی“ مجھے کبھی بھی مومو کو کسی بھی چیز کے لیے پکارنے کی عادت ہی نہ پڑی تھی، اسی لیے میں ساری عمر سیکھ ہی نہیں سکا کہ اس مڑی ہوئی پلکیوں والی لڑکی کو پکارنا ہے۔

”حسان صاحب! بہتر تھا کہ مہر کے نادر آتے۔“ مومو کی نکاس تھری کی انجارج (نام مجھے یاد نہیں) نے مجھے پیئرٹ پیپر میٹنگ میں دیکھ کر بے اختیار کہا تھا۔

”وہ ملا نکشائے ہوئے ہیں۔“

”کیا وہ ہمیشہ کہیں نہ کہیں گئے ہوئے نہیں ہوتے؟ خیر، یہ دیکھیں مہر انشاء نے نکاس روم کا گل دان توڑ ڈالا ہے۔“

”اس سے غلطی سے ٹوٹا ہو گا، ورنہ وہ خاصی سمجھ دار ہے۔“ پھر بھی آپ فائن بتائیں۔“ میں نے جیب میں

بنوے کے لیے ہاتھ ڈالا۔

”میں نے آپ کو جرمانہ بھرنے کے لیے نہیں بلایا۔“

ناک پر رکھی عینک کے پیچھے سے مجھے دیکھتے ہوئے ان کا انداز قطعی اور دو ٹوک تھا۔ ”مومو نے گل دان توڑ دیا، یہ قابل معافی بات تھی، مگر اس نے بجائے مجھے بتانے کے، نوٹے گل دان کی کرجیاں کپ بورڈ میں چھپا دیں۔ وہ تو بعد میں میں نے سختی سے پوچھا تو اس نے بتایا۔“

میں لب بھینے انہیں دیکھتا رہا۔

”مجھے غصہ گل دان توڑنے پر نہیں بلکہ اس کا اپنی غلطی پر پردہ ڈالنے پر چڑھا ہے۔ وہ ہمیشہ یہی کرتی ہے۔“

”میں اسے سمجھاؤں گا میڈم!“

اسی شام مومو کو اپنے سامنے اسٹڈی روم میں بٹھا کر میں کافی دیر لب بھینے، سنجیدہ نگاہوں سے اس کا چہرہ نکلتا رہا۔

”کیا ہوا سرا؟“ میری نگاہوں کی سنجیدگی سے قدرے خائف سی ہو کر اس نے مڑی ہوئی پلکیں اٹھا کر مجھے دیکھا۔

”مومو تم نے واز توڑا ہے؟“

بھوری آنکھوں میں یکبارگی خوف سٹ آیا۔ ”آپ کو کس نے بتایا، سرا؟“

”مجھے میری بات کا جواب دو۔“ میں نے تیز لمبے میں کہا۔ س نے سر جھٹک لیا۔

”مومو۔“ میں نے لہجہ قدرے دھیمہ کر دیا۔

”غلطی سے ٹوٹا تھا۔“ اس کی باریک اور معصوم آواز ابھری۔

”پھر تم نے اسے چھپا کیوں دیا؟“ اس نے ہاتھ پر آئے ہل بناتے ہوئے سراٹھا کر مجھے دیکھا۔ ”میڈم ڈانٹیں اس لیے!“

”اگر تم میڈم کو سچ بتا دیتیں تو وہ نہ ڈانٹیں۔“

”سچ بولنے پر ڈانٹ نہیں پڑتی؟“

”بالکل بھی نہیں!“ میں زور دے کر بولا۔

اس کے لبوں پر ایک استہزائیہ مسکراہٹ در آئی۔

مٹ بالکل غلط اس روز حلیمہ کی بیٹی سے ملا ٹوٹ گیا تھا داد نے پوچھا تو اس نے بتا دیا داد نے اسے بہت ڈانٹا۔ اس نے بھی کوچ بولا تھا؟“ وہ میری ٹانگ جتنی لڑکی مجھ سے بحث کر رہی تھی۔

اس کے انداز سے ناراضی جھلک رہی تھی۔ ”اور میں نے جھوٹ بھی نہیں بولا۔ میڈم نے مجھ سے پوچھا تھا تو

میں نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ میں نے نہیں توڑا۔“

”تم نے کچھ بھی نہیں کہا تھا، اور یہ بھی جھوٹ ہوتا ہے۔“

”اور آپ بھی تو ہر پیئرٹ پیپر میٹنگ میں میڈم کو یہ کہتے ہیں کہ پایا ملا نکشائے ہوئے ہیں، پایا سنگاپور گئے ہوئے ہیں، یہ بھی تو جھوٹ ہوتا ہے نا؟“

اس کا جملہ بہت غیر متوقع تھا۔ ”مومو! پایا بڑی ہوتے ہیں۔“ میں نے بات کا رخ بدل کر اس بچی کو مزید صاف گوئی سے روکنا چاہا۔

”پتہ ہے۔“ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر اندر چلی گئی۔

مجھے لگا وہ چھوٹی سی لڑکی مجھ سے ناراض ہو گئی ہے۔ اب میں کیا کروں؟ اسے کیسے مناؤں؟ مجھے تو مومو کو منانا ہی نہیں آتا تھا۔

میں جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ جانے سے پہلے حلیمہ اسے روز چائے کا ایک کپ پکڑاتی تھی جو وہ مجھے لا کر دیتی تھی، مگر میں جانتا تھا۔ اس روز مومو نہیں آئے گی، اسی لیے جانے لگا۔

”سرا! چائے!“ جانے کس کونے سے نمودار ہو کر اس نے اپنے مجھے نئے ہاتھوں سے چائے کا کپ میرے سامنے رکھا، مجھے بے حد حیرت ہوئی تھی۔

شاید مومو ناراض نہیں تھی۔

یا پھر شاید اسے مجھ سے توقع نہیں تھی کہ میں اسے مناؤں گا۔



مومو آٹھ برس کی ہوئی تو میں نے اسے رنگین صفحوں والی غالب ”سنڈر بلا کی اسٹوری بک لا دی۔ اگلی شام جب میں حسب معمول اسے پڑھانے آیا تو اس نے مجھے میٹھس کے نیبلز سنانے کی بجائے سنڈر بلا کے متعلق سوالات کرنے شروع کر دیے۔

”سرا! سنڈر بلا کے باپ نے دوسری شادی کیوں کر لی تھی؟“ اس کا معصوم ذہن جو سوالات بناتا تھا، وہ ان کے جوابات مجھ سے پوچھ رہی تھی۔

اس روز اس نے ہالوں کی فرنیچر بٹھا رکھی تھی، جبکہ اسکرٹ اور بلاؤز میں ملبوس تھی۔ رنگ تو مجھے یاد نہیں، اب اس پڑھاپے میں میں ستر کی دہائی میں ہونے والی باتیں باریکوئی کے ساتھ تو یاد نہیں رکھ سکتا، بہر حال وہ بچپن

میں عموماً اسکرٹس پہنا کرتی تھی جو اس پر بے حد اچھی لگتی تھی۔

”سر! مجھے اور بھی بکس لادیں۔“ اس نے فرمائش کی میں نے دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ سر ہلادیا۔

پھر آہستہ آہستہ میں مومو کے لیے چھوٹے چھوٹے تحائف لانے لگا۔ میرے گفٹس ہمیشہ کوئی اسٹوری بک یا کٹرنگ بک ہوتے تھے۔

پھر ایک دن آنٹی نے مجھے ٹوک دیا۔ ”حسان! وہ اتنی سی ہے اس کو اتنی کتابیں مت پڑھاؤ۔“

مگر میں نے ہنس کر پل دیا کہ ”رہنے دیں! میں تو دیکھ بھال کرا چکی کتابیں ہی لاتا ہوں جو اسے شعور دیں۔“ تو آنٹی خاموش ہو گئیں۔

اس روز بھی اس کے لیے بک خریدنے اسٹور پر گیا تو مجھے اشفاق احمد کی ”ایک محبت سوانح“ وہاں نظر آئی میں نے وہ خرید لی اور اس میں سے دو ایسے افسانے جو ہر لحاظ سے مومو کی عمر کے لحاظ سے محبوب اور غیر موزوں نہ تھے مارک کر لیے۔

”یہ دو پڑھ لیتا۔“ شام کو اسے کتاب دیتے ہوئے میں نے تاکید کی۔

اس نے عدم دلچسپی سے کتاب اٹھائی ”الٹ پلٹ کر دیکھا اور قدرے اداسی سے واپس رکھ دیا۔“

”آپ کوئی اور بک لے آتے سر۔“ اسے شاید اتنی عجیبی اور دوامی کتاب میں دلچسپی نہ تھی۔

”شاید پسند نہیں آئی تھیں۔ مگر پڑھ کر دیکھ لو۔“

”یہ بات نہیں ہے سر!“ اس نے سر جھٹکا ”پھر عادتاً“

میز پر کہنی رکھتے ہوئے بولی ”دراصل میں یہ پڑھ چکی ہوں۔“

مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ ”تم تم یہ پڑھ چکی ہو؟ کہاں سے لی؟“

”بیانی لا بھری سے۔“ وہ بڑے فخر سے مسکرائی۔

”مومو! تم مجھ سے پوچھ کر بکس پڑھا کر۔“

اس کے لبوں سے مسکراہٹ یکدم معدوم ہو گئی وہ کہنی میز سے ہٹا کر قدرے موڈب سی ہو کر بیٹھ گئی۔ ”جی سر!“

وہ ڈر گئی تھی اسی لیے نرم لہجے میں اس سے کہا۔

”وہ اس لیے کہ میں تمہیں ان کا بیک گراؤنڈ وغیرہ سمجھا سکوں۔“

اس کے چہرے پر مجھے قدرے اطمینان دکھائی دیا۔ میرا خیال تھا۔ اب وہ مجھ پر اعتبار کرنا سیکھ لے گی مگر یہ میری بھول تھی۔ ہاں یہی تو میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں یہی کہ ہم میں سے کسی کو دوسرے پر اعتبار نہ تھا مگر ایسے آپ کو میری بات سمجھ نہیں آئے گی۔ آپ کو مومو کی پوری داستان سننا پڑے گی۔

☆ ☆ ☆

مومو میرے سامنے بیٹھی سائنس کا ہوم ورک کر رہی تھی میں اخبار پڑھتے ہوئے گاہے بگاہے اس پر نظر ڈال ہی لیا کرتا تھا۔ یکدم مجھے کچھ یاد آیا۔

”مومو!“ میں نے اخبار تہہ کر کے میز پر رکھتے ہوئے اسے پکارا۔ وہ جو کاپی پر جھکی ہوئی تھی ہاتھ روک کر مجھے دیکھنے لگی ”جی سر؟“

”تمہارا ٹیسٹ ہو گیا سائنس کا؟“

”جی سر!“

”کتنے مارکس آئے؟“

وہ پل بھر کو خاموش رہنے کے بعد بولی ”وہ تو پچھرنے واپس ہی نہیں کیا۔“

میں اکتیس سال کا مرد و وہ نو سال کی بچی مجھے صاف پتہ چل گیا وہ جھوٹ بول رہی تھی۔

”کھڑی ہو جاؤ!“ ایک دم میں دوست سے نیچر بننے ہوئے درشتی سے بولا وہ ہکا بکا کھڑی ہو گئی۔

”اپنا بیک کھول کر مجھے دکھاؤ۔“ میں نے حکم دیا۔ وہ مرے مرے ہاتھوں سے بیک کھولنے لگی۔ وہ جان بوجھ کر آہستہ آہستہ کھول رہی تھی میں نے بیک اس سے لے کر کھول دیا۔ سامنے سائنس کا ٹیسٹ پڑا تھا۔ میں نے ایک کالٹ وار نگاہ اس پر ڈال کر ٹیسٹ اٹھایا ”پھر نمبر پڑھ کر ٹیسٹ اس کے سامنے پھینکا۔“

”یہ اس پر سے 10 میں سے 4 نمبر پڑھ کر مجھے بتاؤ کہ تم نے nutrition والا سوال کیوں نہیں یاد کیا تھا اور مجھے یہ بھی بتاؤ کہ تم نے ٹیسٹ چھپایا کیوں؟“ اس کی یہ غلطی کر کے چھپا دینے کی عادت مجھے خوب تاؤ دلا رہی تھی۔

اس نے سر جھٹکا دیا۔ ”میں ڈرامہ دیکھنے لگی تھی اور چھپایا اس لیے کہ آپ ڈانٹتے۔“

”میں نے تمہیں ہزار دفعہ سمجھایا ہے کہ غلطی کر کے اس پر پردے مت ڈالو مگر تم ہو کہ۔۔۔“ غصے سے میں

”جنرل ضیا اور کون سر؟“ اس نے شاکی نظروں سے مجھے دیکھا۔ ”خیالے کل بھٹو کو پھانسی دے دی ہے۔“

”لاحول ولا قوۃ! مومو تم۔۔۔!“ مجھے اس وقت اس پر شدید غصہ آیا تھا ”یہ بات تھی جس پر تم نے مجھے اتنا پریشان کیا ہے؟“

”آپ کو افسوس نہیں ہوا سر؟“ اس کے انداز میں حیرت تھی۔

”مومو! یہ پالیسی کس ہے؟ تم اتنی سی عمر میں ان سیاست دانوں کو نہیں سمجھ سکتیں اور مجھے نہیں پتہ تھا کہ تمہیں بھٹو اتنا پسند تھا“ میرا عملی طور پر سیاست سے کوئی واسطہ نہ تھا مگر چونکہ ابو کرم مسلم لیگ تھے تو ظاہر ہے میری بہر دیاں ضیاء کے ساتھ تھیں۔ ایسے میں مومو کا رویہ میرے لیے حیران کن تھا۔

”سر! مجھے پالیٹکس کا پتہ نہیں مگر بھٹو مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔“ وہ افسوس سے کہہ رہی تھی۔

”دماغ خراب ہے تمہارا۔۔۔ یہ تمہاری عمر ہے سیاست میں دلچسپی لینے کی؟ خبردار جو میں نے تمہیں آئندہ اخبار پڑھنے دیکھا۔ اتنا پریشان کیا تھا مجھے اب انھو ذرا“

”مگر سر۔۔۔“ میں اس کی ایک سنے بغیر اسے باہر لے آیا۔

”ارے حسان! دیکھو ذرا اس لڑکی کو کیا ہوا ہے؟ صبح سے کمرے میں بند ہے۔“ مجھے دیکھ کر آنٹی کو مومو کی اداسی کا خیال آیا۔

”یہ میرے ساتھ کھڑی ہیں محترمہ! کچھ نہیں ہوا، بس ذرا سادہ دماغ خراب ہو گیا ہے۔ ابھی ٹھیک کر کے لاتا ہوں۔“ میں مومو کا ہاتھ پکڑ کر اسے باہر لے آیا۔

”نکد حشر سر؟“

”کیس جا کر تمہیں آئسکریم کھلاتے ہیں، تاکہ تم پر سے یہ سوگ اترے۔“ مجھے ابھی تک غصہ پڑھا ہوا تھا۔

”سر!“ اس نے تاسف سے مجھے دیکھا۔ ”آپ کو پتا ہے میں آئسکریم نہیں کھاتی“

”افوہ؟“ وہ جتنا میری باتیں یاد رکھتی تھی میں اتنا ہی بھول جاتا تھا۔ مومو کو میٹھے کے نام پر ہر شے سے الرجی تھی۔

”میری زندگی میں آنے والی واحد لڑکی تھی جو چاکلیٹ کو too sweet اور آئسکریم کو too cold کہہ کر رد کرتی تھی۔“

”چلو چل کر کڑوی سی کافی پیتے ہیں، وہ تو تم شوق سے پیو گی نا؟“ میرے جملے بھنے انداز پر وہ ہنستے ہوئے گاڑی کی جانب بڑھ گئی۔

☆ ☆ ☆

میں نے جوں ہی چائے کی پیالی سے آخری گھونٹ بھرا، میرے سامنے والے صوفے سے مومو ابھی اور اندر چلی

خواتین: سب 133 اگست 2008

WWW.PAKSOCIETY.COM

خواتین: سب 132 اگست 2008

گئی۔
”حسن شادی کرلو۔“ آنٹی نے اپنا مک ختم کر کے میز پر رکھتے ہوئے فیصلہ کن انداز میں کہا تھا۔
”اچھا!“ قدرے ہنس کر میں نے چائے کا کپ سائیڈ پر رکھا۔

”عالموت۔ میری نظر میں ایک بہت اچھی لڑکی ہے۔“
ان کی آواز میں ماؤں کی سی فکر مندگی تھی۔
”اچھا کون؟“ میں نے سگریٹ کے پیکٹ سے سگریٹ نکال کر لبوں تلے رکھی اور لاسٹر سے اسے سلگایا۔ اسی پل مومو ہاتھ میں ایش ٹرے لیے لاؤنج میں داخل ہوئی اور اسے میرے صوفے کی سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر اپنی نشست سنبھال لی۔ اسے علم تھا کہ میں چائے کے بعد سگریٹ ضرور پیتا ہوں۔

”عفت آبا کی بیٹی تائے۔ اسی سال اس نے ماسٹر کیا ہے۔ صورت ٹھیک ٹھیک اچھی ہے اور۔۔۔“ پھر تائے بی بی کی جملہ خصوصیات پر طویل ٹیکچر دے کر قدرے بے چینی سے انہوں نے استفسار کیا۔

”اب بتاؤ چلاؤں رشتے کی بات؟“
”ہوں۔ جیسے آپ کی مرضی۔“ میں مسکرایا۔ تائے کو میں کافی عرصے سے جانتا تھا۔ وہ میری اور حیدر کی سیکنڈ کزن تھی۔ بلاشبہ وہ ایک آئیڈیل لڑکی تھی۔
”کس کے رشتے کی بات دادو؟“ رشتے کا لفظ سن کر مومو نے نہایت دلچسپی سے پوچھا۔

”تمہارے سر کے رشتے کی بات کر رہی ہوں۔“
”سر کے؟“ اس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ ”سرا شادی کریں گے؟“

”کیوں؟ کیا شادی کا حق صرف تمہارے ابا کو ہے؟“
یونہی مذاق میں میرے منہ سے نکل گیا ”اگلے ہی پل مومو کے چہرے پر پھیلنے والی ویرانی دیکھ کر بے حد ہچکچاتا۔“
”میرا مطلب تھا۔۔۔“ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا وہ تیزی سے اٹھ کر اندر چلی گئی۔
”ماں یاد آگئی ہوگی۔“ اسے جاتا دیکھ کر آنٹی نے تاسف سے سر ہلایا۔

میں ایک دم افسردہ سا ہو گیا۔ شاید میں نے مومو کو بھی اداس کر دیا تھا۔ ایک لمحے کو میں نے اٹھ کر اس کے پیچھے جانے کا سوچا مگر مجھے تو مومو کو منانا ہی نہیں آتا تھا۔ سو میں بیٹھا رہا۔

چند ثانیہ بعد وہ خود ہی واپس آگئی۔ اس کی بھوری آنکھوں میں پچھپی اداسی کو میں ماں کی موت کا ہر ہوا تازہ دم جان کر خاموش رہا۔

تائے اور میرا رشتہ اگلے دو ماہ کے دوران طے ہو گیا۔ میں برسر روزگار، ویل سپینڈ آؤی تھا۔ ٹھیک ہے اتنا منڈ سم نہیں تھا۔ مگر فنانسلی مضبوط تھا اور وہ بھی بڑھی لکھی، خوب صورت اور قابل لڑکی تھی۔ بھلا کس کو اعتراض ہو نا تھا سب کچھ خوش اسلوبی سے طے پا گیا۔ مگر کوئی خوش نہیں تھا تو وہ مومو تھی۔

اس روز میں تائے کو لے کر حیدر کی طرف چلا گیا۔ میں تائے کو مومو سے ملوانا چاہتا تھا۔ مومو دروازے پر ہی ہمیں مل گئی۔

”یہ مومو ہے نا؟“ اسے دیکھ کر تائے مسکرائی۔ مومو نے نظریں اٹھا کر اسٹائش اور طرح دار سی تائے کو دیکھا اور پھر میری جانب متوجہ ہوئی۔
”سرا! کل میرا انگلش کا ٹیسٹ ہے۔ مجھے تیاری تو کر اویں پلینز۔“ اس کا انداز عجیب سا تھا۔

”یار! ابھی تو ہم آئے ہیں۔ اندر تو آنے دو۔“ ہلکے پھلکے انداز میں میں کہہ کر آگے بڑھا۔ وہ سائیڈ پر ہو گئی۔
ڈرائنگ روم میں بیٹھنے کے چند لمحے بعد ہی مومو وہاں آ گئی۔ آنٹی اتفاق سے گھر پہ نہیں تھیں۔ ہم بتا کر نہیں آئے تھے۔ غلطی سراسر ہماری تھی۔ اب مومو سی ہماری میزبان تھی۔

”تو یہ ہے مہر النساء! حسان صاحب کی چھوٹی سی فرینڈ جس نے نسیم حجازی سے لے کر کرشن چندر تک سب کو پڑھ لیا ہے۔“ تائے کے انداز میں ستائش تھی۔
مومو نے خاموش نگاہوں سے اسے دیکھا مگر بولی کچھ نہیں۔ اس نے پنک کمر کی شلوار قمیض پہن رکھی تھی اور لمبے بالوں کی چٹیا بنا رکھی تھی۔ شلوار قمیض میں وہ قدرے مختلف لگتی تھی۔ مگر فی الحال یہ اس کا رویہ تھا جو مجھے مختلف لگتا تھا۔

”ہاں یہی مومو ہے۔ ابھی بے تکلف نہیں ہے تائے سے اس لیے بول نہیں رہی۔“ میں نے مسکرا کر کہا مگر تائے زیادہ محسوس نہ کرے۔
پھر تائے نے اس سے مزید باتیں کرنے کی کوشش کی مگر

وہ ہوں ہاں میں جواب دیتی یا خاموش رہتی۔
میں اس کے روکھے رویے کی وجہ نہیں جان پایا تھا۔
”سرا! میسٹ!“ ہم واپس جانے لگے تو اس نے مجھے روک لیا۔ شاید وہ چاہتی تھی کہ میں رک جاؤں اور تائے چلی جائے۔

”ہاں میں فارغ ہوا تو شام میں آؤں گا۔“
ہوئے سے اس کا گال چھپتا تھا اس کی چہرے پر پھیلنے والی مایوسی نظر انداز کر کے میں آگیا۔
سسرال میں بیٹھ تھا۔ وہاں ایسا پچھنسا کہ رات کو دیر سے باغ ہوا۔ بے اختیار مومو کی طرف تباہ کئے کا افسوس ہوا مگر یہ اطمینان تھا کہ اس نے ٹیسٹ خود تیار کر لیا ہو گا۔

یہ چند روز بعد کا قصہ ہے میں مومو کو اس کے اسٹڈی روم میں انگلش ٹیچنگس کر رہا تھا جب اچانک وہ بولی ”سر جی؟“

”سرا یہ جو تائے آنٹی ہیں نا یہ۔۔۔“ وہ رک گئی۔
”ہاں بولو یہ کیا؟“ میں پین رکھ کر پوری طرح سے اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔ آخر میں اس کی تائے سے پر خاش کی وجہ جانے چاہتا تھا۔

”کل ہم ان کے گھر گئے تو میں نے خود سنا سنا وہ اپنے ڈاکو کو چلی دے کر لار رہی تھیں۔“
”مومو!“ میں نے اسے گھورا۔

”جھوٹ کب سے بولنے شروع کر دیے ہیں تم نے؟“
وہ ایک دم سٹپا کر اپنے ہاتھوں کو دیکھنے لگی۔ تائے کو کئی کئی عرصے سے جانتا تھا وہ خاصی مذہب نشاۃ اور جیسے اب دلچسپی میں بات کرنے والی لڑکی بھلا گئی کیسے دے سکتی تھی۔ مجھے مومو پر غصہ آیا تھا۔

”میں اچھی طرح جانتا ہوں تمہاری تائے آنٹی کو۔ یوں کی برائی نہیں کرتے۔ اب ایسی بات نہ کہنا۔“ لہجے کو ہموار رکھ کر بھی میں نے اسے اچھا خاصا ڈانٹ دیا۔ وہ نب نہلتے ہوئے اپنی گود میں دھرے ہاتھوں کو دیکھتی رہی۔
”میں ایک لفظ نہ بولی۔“

”تمہیں تائے آنٹی بری لگتی ہیں مومو؟“ میں نے اب زیادہ زور سے پوچھا تو اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔

”نہیں۔ بہت زیادہ۔“ پھر وہ۔۔۔ کاپی پر جھک کر اپنا کام کرنے لگی۔

وہ چھوٹی بچی جسے کسی وجہ سے تائے بری لگتی تھی اس کی ذات سے سچی جھوٹی باتیں منسلک کر کے مجھے بتا رہی تھی۔ بچے عموماً ایسی حرکتیں کرتے ہیں اور میرے نزدیک یہ ایسی بڑی بات نہ تھی۔

مومو میری بہت پیاری دوست اور تائے میری ہونے والی بیوی تھی۔ میں دونوں کے درمیان تلخی نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے جب اس روز عفت آنٹی کے یہاں کسی کام سے میں ان کی طرف جانے لگا تو کچھ سوچ کر گاڑی حیدر کے گھر کی جانب جانے والے رستے پر ڈال دی۔ حیدر کی کالونی کی سڑک پر داخل ہوتے ہی مجھے مومو دکھائی دی۔ وہ میری گاڑی سے قدرے آگے سڑک پر سائیکل چلا رہی تھی۔

اس نے بلیو Baggy جینز اور سفید آٹھے بازوؤں والی کھلی سی ٹی شرٹ کے اوپر بالوں کی لمبی سی فریج بزنڈ بنا رکھی تھی۔ میں اس کی پشت پر تھا۔ گاڑی قدرے آگے لے جا کر اس کے ساتھ لے آیا۔ گاڑی دیکھ کر اس نے سائیکل سائیڈ پر کرنا چاہا۔ پھر دفعتاً ڈرائیونگ سیٹ پر نگاہ پڑی تو دوسرے تائے مجھے وہاں دیکھ کر چونکی۔

”سرا! آپ ادھر؟“
”تم اتنی دیر میں باہر کیوں پھر رہی ہو؟“ میں نے اپنی جانب کاشیشہ کھول دیا۔ وہ سائیکل روک کر اتر گئی۔

”میں بس رائیڈنگ کر رہی تھی۔ آپ بتائیں آپ اتنی دیر میں باہر کیوں پھر رہے ہیں؟“ وہ شرارت سے کربولی۔
”میں تمہیں پک کرنے آیا ہوں۔ چلو جھو اندر۔“ میں نے فرنٹ سیٹ کا آگ کھول دیا۔

”اور یہ سائیکل؟“
”اسے بھاگ کر گھر چھوڑ آؤ۔ تمہارے پاس صرف ایک منٹ ہے۔“ میں نے مصنوعی تنکم سے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

”آپ کیا مجھے کافی پلانے لے جا رہے ہیں؟“ کچھ دیر بعد جب وہ سائیکل گھر چھوڑ کر میرے ساتھ گاڑی میں بیٹھی تو پوچھنے لگی۔

”ارے نہیں ہم تمہاری تائے آنٹی کے گھر جا رہے ہیں۔ عفت آنٹی کو کچھ چیزیں دینا تھیں۔ بس پانچ منٹ لگیں گے۔“ میری وضاحت پر وہ سر ہلا کریشے کے پار دیکھنے لگی۔
عفت آنٹی کے گھر کی ڈورنیل خراب تھی۔ چونکہ دروازہ کھلا تھا ہم اندر داخل ہو گئے۔
”تم پہلے آئی ہو ادھر؟“

”جی کئی دفعہ۔“ اس کے انداز میں سنجیدگی تھی۔ میں نے گردن پھیر کر اسے دیکھا۔ وہ میرے بائیں طرف روش بر میرے ہمراہ چل رہی تھی۔ اس کا سر میرے بائیں بازو کی گھنٹی تک پہنچ رہا تھا۔

مرکزی دروازہ کھولنے کے لیے ہاتھ گولڈن کلر کے خوب صورت ہینڈل پر رکھ کر اسے گھمایا ہی تھا کہ دروازے کی درز سے اندر سے آنے والی بلند آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

”بشیرا! بشیرا!“ وہ نامہ تھی اور وہ چارہ ہی تھی۔ ”کدھر مرجاتی ہو؟ نشہ کر کے سوئی ہو؟ ادھر آؤ یہ برتن تمہارا باپ اٹھائے گا؟“

میرے قدم جہاں تھے وہیں تھم گئے۔ میں سُن سا ہو کر رہ گیا۔ مومو کا ہاتھ ابھی تک ہینڈل پر تھا۔ اس نے سر گھما کر میری طرف دیکھا اور بے نیازی سے بولی۔

”See I told you!“ اس نے بے نیازی سے شانے جھٹکے ”مگر آپ کو مومو ہمیشہ جھوٹی ہی لگتی ہے۔“ اس نے ہینڈل گھما کر دروازہ پورا کھولتے ہوئے زور سے ناک کہا ”نامہ آنٹی سے وی کم ان؟“ آج اس کا لہجہ کھردرا یا روکھا نہیں بلکہ فاتحانہ اور سرخ روئی کا تاثر لیے ہوئے تھا۔ میں خود کو کمپوز کر کے زبردستی چہرے پر مسکراہٹ سجائے اس کے پیچھے اندر داخل ہوا۔

نامہ جولاؤج میں صوفے پر ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھی دیکھ رہی تھی، ہمیں دیکھ کر بری طرح چونکتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ارے آپ لوگ آئیے نا۔۔۔“ لباس کی ٹکلیں درست کر کے اس نے دوپٹہ ٹھیک سے اوڑھا۔

”دراصل بیل خراب تھی اس لیے ہم بلا جھجک اندر آ گئے۔“ آنٹی کہاں ہیں ان کی چیزیں دیتا تھیں۔ ”میں نے کھڑے کھڑے وضاحت کی جبکہ مومو بڑے آرام سے صوفے پر بیٹھ گئی۔

”مُمی تو سو رہی ہیں، ٹھہریں میں اٹھاتی ہوں۔“ وہ اپنی مصنوعی شائستگی سے کہتے ہوئے اندر جانے لگی مگر میں نے فوراً ”روک دیا۔“

”نہیں انہیں مت اٹھائیں۔ بس بتا دیجیے گا کہ میں آیا تھا۔ چلو مومو۔“ میں نے مومو کو پکارا جو بڑی خوشی خوشی نامہ کے لاؤنج کا جائزہ لے رہی تھی۔

”آپ لوگ بیٹھیں تو سہی۔“ اس نے صوفے پر رکھے

کشن درست کیے۔

”نہیں نہینکس نامہ! ہم چلتے ہیں۔ مومو کی ٹیوشن وقت ہونے والا ہے۔ چلو مومو!“

میں نے صوفے پر استحقاق سے بیٹھی مومو کو گھورا۔

”کوئی بات نہیں سہرا کل کوئی ٹیسٹ نہیں ہے۔ آؤ چھٹی ہو جائے گی تو کچھ نہیں ہوگا۔“ اس نے اطمینان سے مدبرانہ انداز میں کہا۔

”بہت شوق ہے تمہیں چھٹی کا، چلو اٹھو۔“ بوکھلائی گھبرائی نامہ کو خدا حافظ کہہ کر میں مومو کو ہاتھ سے پکڑ کر کچھنچتا ہوا باہر لے آیا۔ واپسی پر تمام راستہ ہم دونوں میر

کوئی بات نہ ہوئی۔ جب میں نے گاڑی اس کے گیٹ کے سامنے روکی تو اس نے اترنے کے لیے لاک کھولا۔

”مومو!“ میری آواز پر وہ دروازہ کھولتے کھولتے رک گئی ”جی سر؟“

”جب میں نے تمہیں کہا تھا کہ تم نے جھوٹ بولا ہے تب تم نے کیوں اپنی صفائی میں کچھ نہیں کہا؟“ میں بہت سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔

اس نے اپنی مڑی ہوئی پٹلیں اٹھائیں۔ ”سہرا داد گنتی ہیں جو لوگ سچے ہوتے ہیں انہیں صفائی دینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ سہرا غلیل جبران کہتا تھا، ”میں نے کہا میں نے مان لیا، اس نے زور دیا، مجھے شک گزرا“

اس نے قسم کھائی، میں نے کہا ”یہ تو جھوٹ بولتا ہے۔“ میں نے ہنس کر ٹال دیا۔ اسی اثناء میں حیدر داخلی دروازہ

ہولے سے مسکرائی۔ ”پھر بھی سہرا آپ کو میں ہمیشہ جھوٹی ہی لگتی ہوں۔“

”مگر مومو۔۔۔“

”میں جاؤں سر؟“

میں نے ایک گہری سانس اندر کو کھینچی اور اثبات سر ہلا دیا۔

”ہاں جاؤ۔“

”خدا حافظ سہرا! وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔“

یہ ان ہی دنوں کی بات ہے جب عفت آنٹی سرسری طور پر مجھ سے حسن کی آمد کا تذکرہ کیا۔ حسن نامہ کا ماموں زاد تھا، وہ بالکل ویسا ہی تھا جیسا کہ آسنن کا کوئی ہیرو ہوتا ہے۔ بے تحاشا دولت مند، خوب صورت اور شاندار پر سنائی رکھنے والا۔ حسن امرا

سینلڈ تھا۔ اس کا اور اس کے والد کا وہاں کین فوڈ کا وسیع بزنس بزنس تھا۔ وہ دونوں سال دو سال بعد پاکستان کا چکر بڑی لیتے تھے مگر اس دفعہ وجہ کچھ خاص تھی۔

آنٹی نے مجھ سے ذکر نہیں کیا مگر بہر حال میں کوئی بچہ تو نہ نہیں۔ تینتیس سالہ میچور مرد تھا۔ اتنا تو بہر حال جان گیا

تاکہ حسن کے والد احمد مراد نے نامہ کا رشتہ میرے اور نامہ کا رشتہ طے ہو جانے کے چند روز بعد مانگا تھا۔ وہ یقیناً اس بات سے لاعلم تھے کہ میرا رشتہ نامہ کے

بدین قبول کر چکے ہیں۔ چونکہ ابھی صرف زبانی کلامی بات ہوئی تھی اس لیے نامہ کے گھر والوں نے ہمارا رشتہ

اپن نہیں کیا تھا۔ اس کے ماموں کو ان کے اصرار پر اس بات کا علم ہوا تو وہ اپنے بیٹے سمیت پاکستان پہنچ گئے۔ میں نے ان دنوں نامہ کے گھر جانا قطعاً ترک کر دیا تھا۔

اور پھر جب میں اس روز مومو کو پرہانے گیا تو آنٹی مجھے ندرے بچھی بچھی لگیں۔ میں پوچھتے بغیر نہ رہ سکا۔

”کیا بتاؤں حسان! اتنے چاؤ سے تمہارا رشتہ کرایا تھا۔ پہلے تو وہ لوگ راضی تھے مگر اب کھنچے کھنچے لگ رہے ہیں۔ نفٹ آیا کو کل فون کیا تو منگنی کی بات پر وہ کہنے لگیں پھر

”جائے دیں آنٹی! آپ ایسے ہی پریشان ہو جاتی ہیں۔“

”جائے دیں آنٹی! آپ ایسے ہی پریشان ہو جاتی ہیں۔“

”جائے دیں آنٹی! آپ ایسے ہی پریشان ہو جاتی ہیں۔“

”جائے دیں آنٹی! آپ ایسے ہی پریشان ہو جاتی ہیں۔“

”جائے دیں آنٹی! آپ ایسے ہی پریشان ہو جاتی ہیں۔“

”جائے دیں آنٹی! آپ ایسے ہی پریشان ہو جاتی ہیں۔“

”جائے دیں آنٹی! آپ ایسے ہی پریشان ہو جاتی ہیں۔“

”جائے دیں آنٹی! آپ ایسے ہی پریشان ہو جاتی ہیں۔“

توڑ دیے جائیں! آپا نے ہمیں زبان دی تھی۔ اگر بھانجا آتا ہی پیرا تھا تو پہلے اس کا خیال کیوں نہ آیا۔ اس وقت تو بہت خوشی خوشی میرے حسان کا رشتہ قبول کیا تھا۔ وہ بہت کچھ کہہ رہی تھیں۔

حیدر نے مسکرا کر سر جھٹکا ”مُمی بہت بھولی ہیں۔“

”پاپا جوس۔“ مومو کسی بول کے جن کی طرح تازہ اور بچ جوس کا گلاس تھا میرے حیدر کے قریب نمودار ہوئی۔

”تھینک یو مینا!“ حیدر نے گلاس لے لیا۔ میں نے اس کے لہجے پر غور کیا۔ خوش دلی، شفقت، اپنائیت سب

تھا اس میں، بس محبت نہیں تھی یا پھر وہ اتنی میکا کی زندگی گزارنے لگا تھا کہ محبت ہوتی بھی تو محسوس نہ ہوتی تھی۔

میں نے مومو کا چہرہ دیکھا، وہاں کوئی رنج، افسوس نہیں تھا۔ میں گہری سانس بھر کر رہ گیا۔

حیدر اور آنٹی کی باتوں کے باوجود میں نے حسن مراد کی آمد کو نظر انداز کیا تھا مگر پھر نامہ کا میرے آفس فون آیا۔

مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہے۔ 20 جولائی 1981ء دن گیارہ بج کر پچیس منٹ وہ وقت میرے دماغ پر ثبت ہو کر

رہ گیا ہے۔ میں چاہوں بھی تو نامہ کی وہ کال نہیں بھلا سکتا۔ میں نے آپ کو کہا تھا کہ مجھے آپ کو کچھ بتانا ہے۔

میں آپ کو یہی بتانا چاہتا تھا لیکن ابھی آپ کو سمجھ میں نہیں آئے گا۔ آپ کو میری بات سمجھنے کے لیے میری

پوری کہانی سننی پڑے گی۔

”حسان!“ اس نے بہت شرمندہ شرمندہ لہجے میں کہا تھا۔ ”آپ بہت اچھے ہیں اور کوئی بھی لڑکی آپ کے ساتھ

پر فخر کر سکتی ہے لیکن میں وہ لڑکی نہیں ہوں۔ میں بچپن میں بہت سی چیزوں کے لیے ترستی تھی جن میں ایک

آسائشات کی فراوانی بھی تھی۔ گواہ ہمارے حالات بہت اچھے ہیں مگر میں بچپن کے وہ چند سال کبھی نہیں بھول

سکتی، جب ابو کی نوکری چھٹی تھی اور ہم نے اپنا گھر بیچ ڈالا تھا۔“ اس نے گہری سانس خارج کی۔ اس کی سانس کے

اخراج کی آواز مجھے آج بھی یاد ہے۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیش کش

(WWW.PAKSOCIETY.COM)

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے آپ کیلئے پیش کیا۔

ہم خاص کیوں ہیں؟؟؟؟

یہ واحد ویب سائٹ ہے جہاں سے تمام ماہنامہ ڈائجسٹ، ناول، عمران سیریز، شاعری کی کتابیں، بچوں کی کہانیاں، اور اسلامی کتابیں

ڈائریکٹ ڈاؤن لوڈ کرنے کے ساتھ ساتھ آن لائن پڑھ بھی سکتے ہیں۔

fb.com/paksociety

twitter.com/paksociety1

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف

اگر آپ کو ویب سائٹ پسند آئی ہے تو پوسٹ کے آخر میں اپنا تبصرہ ضرور دیں۔

اپنا تبصرہ صرف پوسٹ تک محدود رکھیں۔ درخواست کے لئے رابطہ کا صفحہ استعمال کریں۔

اپنے دوست احباب کو بھی پاک سوسائٹی کے بارے میں بتائیں۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی انتظامیہ سے مالی تعاون کیجئے۔ تاکہ یہ منفرد ویب

سائٹ آپ کیلئے جاری رکھی جاسکیں۔

پاکستانیوں کے ویب سائٹ

WWW.Paksociety.Com



Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

(خواتین ڈائجسٹ 138 اگست 2008)

امریکی کی طرح ساری زندگی میرے ساتھ رہی۔ جس روز مومو کا 8th کلاس کا رزلٹ آنے والا تھا، اس نے مجھے آفس فون کیا۔

”سر! آپ نے اخبار دیکھا؟“ اس کی آواز میں اتنی خوشی اور جوش تھا کہ میں چونکے بغیر نہ رہ سکا۔

”کیوں کیا ہوا؟“

”سر میں نے فڈل بورڈ میں ٹاپ کیا ہے۔ اخبار دیکھیں نا!“ اس کی ٹھنکتی آواز سن کر میں رو نہ سکا، میں سارے کام چھوڑ کر اپنے تک چڑھے باس کی پروا کیے بغیر حیدر کے گھر چلا آیا۔

وہ جولان میں اخبار گود میں رکھے بیٹھی تھی، میری گاڑی گھر کی حدود میں داخل ہوتے دیکھ کر بھانگی ہوئی میرے پاس آئی۔ ”سر! آپ آگئے؟“

اس کی سنہری رنگت شدت جذبات سے گلزار ہو رہی تھی۔ مسکراہٹ اس کے لبوں سے جدا نہیں ہو رہی تھی بلکہ وہ ہنس رہی تھی۔

اس نے اپنی گاڑی سے لان تک چلتے ہوئے بارہ سالا مومو کو دیکھ کر مجھے یوں لگا تھا کہ ”خوشی“ ایک جیسے صورت میں میرے سامنے کھڑی ہے۔

”سر۔۔۔ یہ اخبار دیکھیں نا“ میں نے ٹاپ کیا ہے۔ اس نے اخبار آگے کرتے ہوئے وہ سطر مجھے دکھائی جہاں ”رائساء حیدر“ جگہ گراہا تھا۔

اس کی جوش کیفیت پر مجھے ہنسی آگئی۔ اس کا رزلٹ دیکھنے کے لیے اخبار نہیں، اس کا تعلق رنگ چہرہ ہی کا تھا۔

”مجھے تم پر فخر ہے مومو!“ اخبار اس کے ہاتھ سے لے کر اس کا نام پڑھتے ہوئے میں نے خوشی سے فحور لہجے میں کہا۔ اس نے مجھے مومو کے نیچر ہونے کی حیثیت سے اتنی خوشی ہوئی تھی کہ بیان نہیں کر سکا۔

”مہرائساء“ آئی ایم سوپراؤڈ آف یو!“ میں نے اس کی بری کاٹنی تھپتھپایا۔ ”اینڈ آئی لو یو سوچ!“ اس کی مسکراہٹ ایک لمحے کو وہیں ٹھم گئی، وہ ایک دم توڑ پھوٹ کر لپٹائی بھول گئی تھی۔

”You do sir“۔ اس کے لہجے میں بے خوشگوار حیرت تھی۔

”آف کورس!“ میں مسکرایا۔ ”ہماری مومو بے اتنی اچھی اس سے سب ہی پیار کرتے ہیں۔“

چاہتی۔ یونانی کماوت ہے خوش قسمتی کی دیوی آپ کے دروازے پر صرف ایک دفعہ دستک دیتی ہے۔ میرے دروازے پر وہ دیوی دستک دے رہی ہے۔ پلیز مجھے زندگی سے اپنے لیے کچھ حاصل کر لینے دیں۔“

وہ شاید کچھ اور بھی کہنا چاہتی تھی مگر میں نے فون رکھ دیا۔ میرے اندر بہت کچھ ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا۔

نامہ سے مجھے کوئی افسانوی قسم کا دعواں دھار ساعشق نہیں ہوا تھا۔ وہ تو ایسی تھی جیسے راہ چلتے بہت سے لوگ مل کر پکڑ جاتے ہیں۔ وہ تو اسی دن میرے لیے بہت عام ہو گئی تھی جب میں نے اس کی ”شائستگی“ سنی تھی۔ وہ تو کبھی بھی خاص نہیں تھی۔

میرے لیے صرف ایک شے خاص تھی۔ وفا اور صرف وفا۔ میری ماں مجھے بچپن میں چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ ایک عورت کی اس بے وفائی نے میرے اندر جو خلش رکھ چھوڑی تھی وہ میں کسی دوسری عورت کی وفا سے پر کرنا چاہتا تھا مگر۔

20 جولائی کی اس گرم دسپر کو مجھے علم ہوا تھا کہ عورت تو بے وفائی کا دوسرا نام ہے۔ کبھی میری ماں مریم ثار کی دوبارہ گھر سامنے کی خواہش کی صورت میں اور کبھی نامہ سعید کی زندگی سے کچھ حاصل کرنے کی تمنا کی صورت میں بے وفائی رنگ بدلتی ہے مگر میں اسے ہر روپ میں پہچانتا تھا۔

جانتا ہوں آپ لوگوں میں سے بہت سوں کو میری بات سخت ناگوار گزرے گی، مگر میں نے کہا نا آپ میری تھیوری میری منطق، میری دلیل ابھی نہیں سمجھ سکتے۔ میں پھر کہوں گا کہ آپ کو میری پوری کہانی سننی پڑے گی۔

ناعمہ سے منگنی میں نے اسی شام توڑ دی، آنٹی نے خاموشی سے میری بات سنی اور اسی وقت غفت آنٹی کو فون کر کے سب کچھ توڑ ڈالا۔

نامہ کی شادی اسی سال سردیوں میں ہو گئی، وہ چند ہفتوں بعد امریکہ شفٹ ہو گئی اور جن دنوں مومو 8th میں تھی، ناعمہ کے ہاں دو جڑواں بیٹوں کی پیدائش ہوئی، ناعمہ خواب و خیال، حال یا مستقبل میں کہیں بھی نہیں تھی مگر اس کی عطا کردہ خلش کسی درخت سے چٹنی

وہ ایک دم بہت کھل کر ہنسی جتنی خوشی اسے میرے لپٹنے پر ہوئی تھی، اتنی تو شاید اپنے رزلٹ پر بھی نہیں دیتی تھی۔

”نمبروں میں تمہارے لیے کچھ لایا ہوں۔“ میں نے ہڈی کا دروازہ کھول کر فرنٹ سیٹ پر رکھا سرخ گلابوں کا کے اور ایک بند بیکٹ اٹھایا، جو میں نے راستے میں سے لیا تھا۔

”یہ تمہارا گفٹ میں جلدی میں ہی لاسکا ہوں۔“

”اوہ سرا! فرط جذبات سے اس کی آواز رندہ گئی اس نے دونوں چیزیں تمام لیں۔“ پھول بہت تھے سرا! اس کے انداز میں شکر تھا۔

”پھول بہت نہیں تھے، یہ تو مرتھا جائیں گے، مگر یہ گفٹ تو تمہارے پاس ہمیشہ رہے گا۔“ میری مادہ پرست سوچ کی پروازیں تنگ تھیں۔

”مرتھانے سے کیا ہوتا ہے سرا؟ ان کی خوشبو ان کا اثر اور سب سے بہتر کران کا میسج نہیں ختم ہوتا۔“ سرخ گلابوں کے بکے کو چرے کے قریب لے جا کر اس نے آنکھیں موند کر اسے سونگھا۔

”اچھا کھو لو تو بتاؤ تو سہی تمہیں کیسے لگا ہے۔“ میں نے اس کی بات پر غور نہیں کیا، میں نے کبھی بھی مومو کی بات پر غور نہیں کیا تھا۔

وہ پھول گاڑی کی چھت پر رکھ کر وہیں پورج میں کھڑے کھڑے احتیاط سے ریپر کھولنے لگی۔ میں اپنی گاڑی سے ٹیک لگا کر کھڑا اس کی ایکساٹمنٹ سے محفوظ ہو رہا تھا۔

”واؤ! لاٹ پنک کھر کی ڈاکل والی خوب صورت گھڑی اس کو بہت پسند آئی تھی۔ اس نے جھٹ اس کو کلائی پر پہنا۔

”یہ اسٹریپ بند کر دیں سرا!“ اس نے معصومانہ انداز میں کلائی میری جانب بڑھائی، میں نے مسکراتے ہوئے پنک کھر کا اسٹریپ بند کر دیا۔

”کتنی اچھی ہے نا تمہیں پنک کھر!“ مختلف زاویوں سے گھڑی کو اپنی دودھیا کلائی پر سجائی دیکھنے کے بعد اس نے بہت شکر سے کہا تھا۔

”ارے یہ تو کچھ نہیں ہے کارنامہ تو تم نے انجام دیا ہے اچھا اب اندر آنے دو۔ کب سے ہم پورج میں کھڑے ہیں اور حیدر کہاں ہے؟“ اندر کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے میں نے پوچھ لیا۔

”ایسا ہے بند روم میں۔“

ایک لمحے کو میں نے سوچا کہ اس سے حیدر کی جانب سے ملنے والے تحفے کے متعلق پوچھوں مگر پھر مجھے خیال آیا کہ حیدر کے پاس اسے دینے کے لیے ایک نرم مسکراہٹ کے سوا کچھ نہ تھا۔

”آپ بیٹھیں، میں ذرا نوڈلز لے آؤں۔“ مجھے اسٹڈی روم میں بٹھا کر وہ جانے لگی تو میر نے اسے روکنا چاہا۔

”یہ کھانا پینا بعد میں ہوتا رہے گا، ابھی تو بیٹھو۔“

”نہیں سرا پھر وہ ٹھنڈی ہو جائیں گی اور آپ دوبارہ گرم کی ہوئی چیزیں پسند نہیں کرتے۔“ وہ کہہ کر چلی گئی اور میں مسکرا کر رہ گیا۔

جب سے مومو نے چودھویں سن میں قدم رکھا تھا اس کو ککنگ کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ بقول آنی کے وہ حیدر یا ان کے لیے نہیں صرف میرے لیے کبھی چائیز تو کبھی دسی مرغن کھانے بناتی تھی۔ شاید اس کا یہ شوق اس دن کے بعد پیدا ہوا تھا، جب میں نے اسے باتوں باتوں میں کہا تھا ”مجھے اچھا کھانے کا شوق ہے۔“

وہ نوڈلز لینے گئی تو میں قدرے فراغت سے اسٹڈی روم کا جائزہ لینے لگا۔

میری اور مومو کی کرسی کے درمیان کبھی میز پر رکھے مومو کے اسکول بیگ کی زپ کھلی ہوئی تھی، جس میں سے ایک رنگ برنگی سی کتاب جھانک رہی تھی۔ میں نے قدرے متجسس سا ہو کر وہ کتاب جو دراصل ایک کلر فل سی ڈائری تھی نکالی۔ مومو ڈائری نہیں لکھتی تھی، میں نے پہلا صفحہ کھولا۔

وہاں Amna Ikram's scrap Book لکھا تھا۔

وہ اس کی دوست آمنہ اکرام کی اسکرپ بک تھی۔ جو اس نے یقیناً ”مومو کو فل کرنے کے لیے دی ہوئی۔“ چونکہ وہ ایک قطعاً ”غیر پرائیویٹ“ تھی، اس لیے میں اس کے صفحے الٹ پلٹ کر پڑھنے لگا۔

ایک صفحے پر آکر میں ہنسنے لگا کہ صفحے کے اوپر نیلے مارکر سے Your First Crush لکھا تھا۔ نیچے آدھا صفحہ فل تھا جس میں ہر سطر میں لڑکیوں نے اپنے نام کے سامنے اپنے crushes لکھے رکھے تھے۔ میں نے صفحے

کے وسط میں آخری لکھی ہوئی سطر پڑھی۔

crush was zulfikar ali Bhutto”

”Mehrun Nisa my First

میں نے اسکرپ بک بند کر کے اسے میز پر واپس رکھ دیا۔ چند برس پہلے۔۔۔ اپنی گئی ایک خام خیالی آہستہ آہستہ میرے تنگ دل میں جاری تھی آہٹ پر میں سنبھل کر بیٹھ گیا، مومو ہاتھ میں بھاپ اڑاتے نوڈلز کے پیالوں سے جی ٹرے لیے اندر داخل ہوئی۔

میں نے قدرے بے توجہی سے نوڈلز کھایا۔

”آپ کو اچھی نہیں لگی؟“ مومو اور دوسرے کی عدم دلچسپی محسوس نہ کرے ہوئی نہیں سکتا تھا۔ اس کا چہرہ پل بھر میں اتر گیا۔

”نہیں، یہ بہت اچھے ہیں مگر مجھے تم سے بات کرنی تھی۔“ میں نے پیالہ میز پر رکھ دیا۔

”کیا بات سرا؟“ اس کی آنکھوں میں تشویش تھی۔

”مومو، میں نے یہ اسکرپ بک پڑھی ہے، یو ڈونٹ مائنڈ اٹ، رائٹ؟“

”ناٹ ایٹ آں، سرا!“

”تم نے لکھا تمہارا فرسٹ کرش ذوالفقار علی بھٹو تھا، رائٹ؟“ میں سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔

”جی سرا!“ وہ اب کچھ الجھتی تھی۔

”مومو تمہاری عمر کیا ہے؟“

”چودھ سٹل۔“

”اور تمہارا خیال ہے تمہیں ایسی باتیں کرنی چاہئیں؟“

”سرا، یہ صرف ایک مذاق تھا، فرینڈز کے درمیان ایک ہلکا پھلکا سا مذاق۔“

”یہ مومو، مومو کتابیں پڑھنے کے بجائے اپنی عمر کے مطابق فیشن، کپڑوں، جیولری اور مہندی کے ڈیزائنوں میں دلچسپی لیا کرو۔ اپنی عمر سے آگے بھاگو، ہتھک جاؤ گی، مومو!“

وہ سر جھٹک کر کتابیں کھولنے لگی۔ یہ اس کا خفگی کا اظہار تھا۔ میں نے گہری سانس بھر کر ٹھنڈے ہوئے نوڈلز کے پیالوں کو دیکھا جن کی تعریف میں نے اس کا دل رکھنے کے لیے بھی نہیں کی تھی۔

”مومو جانتی ہو تمہارے ہاتھوں کا کیا مطلب ہوتا ہے؟“

اس روز اس کی لمبی، پتلی، آرسنک انگلیوں کو دیکھ کر میں نے بے ساختہ پوچھا تھا۔ وہ ہنس دی۔

”جی۔۔۔ یہی کہ میں بینٹریا سرجن بنوں گی۔“

”مہنڈ بکل میں تو تمہیں انٹرسٹ نہیں ہے۔۔۔ آرٹ کے متعلق کیا خیال ہے؟“

اس نے ایک نظر اپنے ہاتھوں کو دیکھا، پچھپچھ لیبوں میں دبا کر کچھ سوچ کر بولی ”میں اکثر اسکیبچر بناتی رہتی ہوں۔ دیکھاؤں آپ کو؟“

مجھے حیرت کا جھٹکا لگا۔ مومو پہلی دفعہ کوئی بات میرے علم میں لائے بغیر کرتی رہی تھی، ورنہ وہ تو ہر کام مجھے بتا کر کرتی تھی۔

”اور تم نے مجھے کبھی نہیں بتایا۔“ میں نے خفگی سے شکوہ کیا۔

”وہ بہت اچھے نہیں ہیں۔“ وہ جینیب گئی۔

میں نے میز پر رکھا اخبار منہ کے آگے کر لیا۔ اس نے اخبار کھینچ لیا۔

”میں کوئی مائیکل اینجیلو نہیں بن گئی، جو آپ کو خبر نہیں ہوئی۔ میں نے صرف دو چار تصویریں بنائی ہیں، وہ بھی ماشاء اللہ اتنی بھیاںک ہیں کہ آپ مروت میں بھی تعریف نہیں کریں گے۔ اس لیے زیادہ خفا ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر آپ نے خفگی دکھائی تو پھر ٹھیک ہے!“ وہ بڑے بے نیاز انداز میں ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھ گئی ”میں بھی نہیں دیکھاؤں گی۔“

اس کے اشاکل پر مجھے ہنسی آگئی ”اچھا جاؤ، لے کر آؤ۔“ وہ بے نیازی ختم کر کے فوراً ”اندر بھاگی۔ چند لمحوں بعد دوبارہ نمودار ہوئی تو ہاتھ میں ایک کاپی تھی۔

”یہ۔۔۔ اتنے اچھے نہیں ہیں۔“ اس نے قدرے تذبذب سے کاپی میری جانب بڑھائی۔

وہ جنہیں دو چار تصویریں کہہ رہی تھی، وہ تقریباً 20 کے قریب تھیں اور بہت اچھی تھیں۔ وہ ٹھیک کہہ رہی تھی کہ وہ اینجیلو ٹائپ کا آرٹ نہیں تھا، مگر اس کی عمر کے لحاظ سے اس نے کافی اچھا بنا لیا تھا۔

اس کی ہنسنے لگتی دیکھ کر مجھے بے اختیار کچھ یاد آیا تھا۔

”یہ تو بہت اچھی ہیں مومو! بہت زیادہ، تم کوئی آرٹ اکیڈمی کیوں نہیں جوائن کر لیتیں؟“

میں نے اسے مشورہ دیا مگر اس کا ایسا ارادہ نہیں تھا۔

”سرا! ابھی میرا میٹرک تو ختم ہو جائے، یہ پینٹنگ وغیرہ تو

ساری عمر ہوتی رہے گی۔" اس نے بات ہی ختم کر دی۔
میں اس کے اندر کے مصوّر کو باہر نکالنا چاہتا تھا اس لیے میرے اصرار پر اس نے اپنی مصروفیت سے وقت نکال کر اسکی جگہ بنانے شروع کر دیے۔ میں نے اسے کئی دفعہ کہا کہ وہ میرا کیچ بنائے مگر وہ ٹال جاتی۔



اس کے کیمسٹری کے پریکٹیکل سے پچھلی شام میں اس کی طرف معمول سے قدرے پہلے آگیا۔ پیپرزمیں میں اسے یوشن نہیں پڑھاتا تھا اس لیے اب کافی دنوں بعد آج آیا تھا کہ دیکھ لوں اسے کوئی مسئلہ نہ ہو۔
وہ مجھے علم تھا کہ اس کو کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ آج بھی ماضی پر نگاہ ڈالوں تو سوچتا ہوں کہ روزانہ شام کی وہ ایک گھنٹہ کی یوشن تو محض ایک فارمیسی تھی۔ ورنہ وہ زمانہ یوشنز کا ہرگز نہ تھا۔ مجھے اور مومو کو روز شام ایک گھنٹہ ایک ساتھ بیٹھنے کی اتنی عادت ہو گئی تھی کہ اب ہم بھولے سے بھی یوشن ختم کرنے کا نہیں سوچتے تھے۔
اوپر میں بھی بات کرتے کرتے کدھر نکل جاتا ہوں بوڑھا ہو گیا ہوں نا، بوچھا یا انسان کو قدرے سکی کر دیتا ہے۔ اب تو یادداشت بھی نہیں رہی۔ اسی لیے کہاں سے کہاں نکل جاتا ہوں۔

خیر میں آپ کو مہر آسماء کی کہانی سن رہا تھا اور شاید اس کے کیمسٹری کے پریکٹیکل سے پچھلی شام کا تذکرہ کر رہا تھا۔
"سر۔۔۔! آپ اتنے دنوں بعد!" وہ کچن میں کرسی پر بیٹھی سیب کھا رہی تھی مجھ پر نگاہ پڑتے ہی خوشی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ہاں بھئی تیار رہی ہو گئی پریکٹیکل کی؟" میں بے تکلفی سے کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ "کافی کمبلینٹ ہے؟ میڈم کے سائن کرائے ہیں؟"

"جی سر! سب کچھ کمبلینٹ ہے۔ آپ یہ سیب لیں نا!" سیبوں کی پلیٹ میری جانب کھسکا کر وہ فرنیچ کی طرف بڑھی۔

"میں نے تو پیپرزم سے بھی پہلے سائن کرائے تھے۔" فرنیچ میں سے انگوروں کا لفافہ نکالتے ہوئے وہ بتانے لگی۔
"دیس گڈ!" میں نے سیب کی قاش منہ میں رکھی۔
تمام انگور اس نے نوکری میں ڈال کر سبک کے آگے رکھے اور پھر ان کو اچھی طرح دھو کر اور پانی منتھار کر میرے

سامنے میز پر رکھ دیے۔ اس کو علم تھا کہ میں سیب سے زیادہ انگور شوق سے کھاتا ہوں۔
"لیس نا، سر!" اس نے ایک صاف پلیٹ بھی میرے سامنے رکھی۔
"لیتا ہوں۔ تم ذرا ایک دفعہ مجھے پریکٹیکل نوٹ بک دیکھا دو، میں اپنی سلی کر لوں!" میں انگوروں کے گچھ سے انگور توڑنے لگا۔

"وہ تو سر۔" اس نے قدرے ہچکچاہٹ سے مجھے دیکھا۔
وہ صدف نے مجھ سے مانگ لی تھی اس کو کچھ ڈائیگرامز بنانی تھیں۔

"مومو!" میں نے بے چینی سے مومو کو دیکھا۔ "تمہارا دماغ ٹھیک ہے؟ تم نے کافی صدف کو کیوں دے دی؟ کوئی پیپر سے پچھلے دن بھی کافی دیا کرتا ہے؟" مجھے اس کی نرم دلی پر وہ کرغصہ آ رہا تھا "کل اگر وہ کافی نہ لائی اور تمہارا کوئی سخت قسم کا ایگزامینز کیا تو وہ تو تمہیں قیل کر دے گا۔" وہ لے آئے کی سر اس بے چاری نے چند ڈائیگرامز بنانی تھیں۔

"سار اسال کیوں نہ بنائیں اس نے ڈائیگرامز؟"
"اس کی کوئی مجبوری ہوئی سر!" وہ منظم بن گئی۔
"اور اگر وہ نہ لائی تو؟ تم کیا کرو گی پھر؟" مجھے اس پر بہت غصہ آیا تھا۔

مومو نے ایک لمحے کو خاموشی سے میرا چہرہ دیکھا پھر بولی "سر! جب اس نے کہا کہ وہ لے آئے گی تو وہ لے آئے گی۔ دنیا اتنی بھی بے اعتبار نہیں ہوتی، آپ یوں خواہ مخواہ ہر کسی پر شک نہ کیا کریں۔" میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ "شک؟ میں بھلا کب شک کرتا ہوں؟"

"سر! آپ اپنے علاوہ کسی کو قابل اعتبار نہیں سمجھتے، آپ کو ہر بندے پر شک ہوتا ہے کہ وہ آپ کو دھوکا دے گا، حتیٰ کہ مجھ پر بھی۔" وہ بہت آرام سے انگور کھاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ اسی لیے کہہ رہی ہوں یوں شک نہ کریں وہ لے آئے گی۔"

مومو کی بات درست نکلی۔ وہ اس کی کلاس فیلو صدف واقعی ایگلے دن کافی لے آئی۔ یہ ایک چھوٹی سی، غیر اہم بات تھی مگر اس چھوٹی سی غیر اہم بات نے مجھ پر یہ انکشاف کیا کہ مجھے اس دنیا میں کسی پر اعتبار نہیں حتیٰ کہ مومو پر بھی نہیں۔



اس روز تو مجزبی ہو گیا۔
صبح جب بچے کے قریب، جب میں اپنے گھر سے چند قدم کے فاصلے پر موجود پارک میں پتھر تلی روش پر جا لنگ کر رہا تھا، مجھے سامنے سے مومو آئی دکھائی دی۔

"ہیلو سر!" میرے مخالف سمت سے آئی، بلو جینز اور شرٹ میں ملبوس مومو نے ہاتھ ہلاتے ہوئے بھاگ کر میرا اور اپنے درمیان موجود فاصلہ طے کیا، پھر میرے ساتھ پیچ کر رخ اس طرف کر لیا جس طرف میں بھاگ رہا تھا۔

"وہائیکم ہیلو لنل گزل!" میں اسے اپنے بائیں جانب بھاگتے دیکھ کر بے اختیار مسکرایا۔ "مجھے خوشی ہے کہ تم جا لنگ کرنے لگی ہو۔"

میری دائیں جانب گھاس پر چند لڑکے بیٹھے ایک سرساز کر رہے تھے چند خواتین بھی معمول کے مطابق واک کر رہی تھیں پارک میں روزانہ کی طرح رونق تھی مگر مجھے صحیح معنوں میں رونق آج لگی تھی، کیا مجھے وجہ بتانے کی ضرورت ہے؟

"صبح جلدی اٹھنا بہت مشکل کام ہے سر! مجھے نہیں لگتا کہ میں اسے جاری رکھ پاؤں گی۔" وہ ٹھوڑا سا فاصلہ طے کر کے ہی ہانپ گئی تھی۔

"آپ کو اکیلے بھاگنا ہے تو شوق سے بھاگیں، ورنہ مجھے جوان کر لیں، وہ ایک بچ کی جانب بڑھتے ہوئے بولی تو میں بھی اس کے پیچھے آگیا۔

"تم میری رو میں خراب کر رہی ہو لڑکی! اتنی رنگ ہو اور ایک چکر بھی نہیں لگایا اور میں تم سے عمر میں اتنا بڑا ہوں، پھر بھی روز سناں کے آٹھ چکر لگاتا ہوں۔"

"ارے سر! بندے کا دل جوان ہونا چاہیے، عمر سے کیا ہوتا ہے۔" اس کے انداز میں لاپرواہی تھی، پھر نفس بحال کر کے وہ اٹھ کھڑی ہوئی "گھر جا رہی ہوں! کان کی جانا ہے۔" وہ ان دنوں فرسٹ ایئر میں تھی۔

"یوں کرو، میرے گھر چلو اور کافی پیو۔" کافی اور کتابوں کے معاملے میں میرا اور مومو کا ذوق ایک تھا۔

"یہ ٹھیک ہے!" واپسی پر ہم بھاگنے کے بجائے چل رہے تھے۔ اب وہ میرے دائیں جانب تھی۔ میں نے ایک نظر اس کو دیکھا وہ مجھ سے کتنی چھوٹی، کتنی نازک سی تھی۔ اس کا سر میرے کندھے سے بھی نیچے آتا تھا۔

"ایک بات پوچھوں سر؟" قریب لگے ایک درخت کی نشی سے پتا توڑ کر دونوں ہاتھوں میں لیے وہ اس کے ٹکڑے کرنے لگی۔

"اجازت کیوں مانگ رہی ہو؟"
"اس لیے کہ کہیں آپ مائنڈ نہ کر جائیں۔" اس نے ایک گہری سانس بھری۔
"پوچھو۔"

"آپ کو نامہ آئی یاد ہیں؟"
میں نے نظر اٹھا کر حیرت سے اس غیر متوقع سوال پر اسے دیکھا۔ وہ پتے کے ٹکڑے کرتے ہوئے انہیں روش پر پھینک رہی تھی۔
"ہاں تھوڑی بہت!"

"سر! آپ نے مجھے کبھی نہیں بتایا کہ آپ نے منگنی کیوں توڑی تھی؟"
اس کا سر جھکا ہوا تھا اور نگاہیں پتے پر تھیں، جواب تک آدھا رہ گیا تھا۔

"میں بہت امیر نہیں ہوں مومو اور میرے ہمراہی میں اس کی بہت سی خواہشات تشنہ رہ جاتیں۔ اس کے پاس مجھ سے بہتر خواہش تھی۔"

"یعنی اب آپ کے دل میں ان کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے؟" وہ ڈرتے ڈرتے پوچھ رہی تھی۔

"نہیں اور ایسی بات سوچنی بھی نہیں چاہیے۔ وہ اب میری ہے۔"

"کل دادو نے مجھے بتایا کہ ان کے ہر منڈ نے ان کے بچے چھین کر ان کو طلاق دے دی ہے۔"

"واٹ؟" میں نے رک کر بے یقینی سے اسے دیکھا۔
"مگر کیوں؟"

"وہ ان کے کریکٹر پر شک کرتا تھا۔" مومو سر جھکائے ہٹا رہی تھی، میرے گھے قدم چلے تو وہ بھی ساتھ چل دی۔
وہ اب واپس آگئی ہیں اب آپ سے؟"

"وہ جیسنر کلوز ہو چکا مومو! وہ ایک بے وفا عورت تھی اور ہے، میں سب کچھ برداشت کر سکتا ہوں مگر بے وفائی نہیں۔" میری بات پر اس نے بڑے ہلکے پھسکے انداز میں "اوکے سر!" کہہ دیا۔

پارک سے نکل کر مومو نے اپنے سائیکل کو ان لاک کیا، پھر دونوں ہاتھ اس کے ہینڈل پر رکھ کر اسے ساتھ چلاتے ہوئے پیڈل میرے ہمراہ میرے گھر کی جانب چل پڑی۔

”آپ کی اس گھر کے ساتھ کوئی پرانی دشمنی چل رہی ہے کیا؟“ میرے لوٹنگ روم میں کھڑے ہو کر کافی دیر تک ارد گرد کا جائزہ لینے کے بعد اس نے بے حد معصومیت سے پوچھا تھا۔

لوٹنگ روم کے صوفوں کا کپڑا میلا ہو رہا تھا سینئر نیبل پر رات کے کھانے کے برتن جوں کے توں رکھے تھے۔ لوٹنگ روم سے ملحقہ اوپن کچن کے کاؤنٹر پر تولیہ بھی پڑا تھا۔ میں نے قدرے شرمندگی سے اسے دیکھا۔

”سواری چھوٹی لڑکی! گھر میں ایسے ہی رہتا ہوں۔“ وہ لوٹنگ روم میں رکھے برتن اٹھا کر کچن میں بنے سنگ میں رکھنے لگی۔

”میں ذرا چیخ کر اسوں، تم بیٹھو۔“ اس کو وہیں چھوڑ کر میں آفس کے لیے تیار ہونے چلا گیا، تھوڑی دیر بعد نماز کو کر تو لیے سے بائیں رگڑتے ہوئے نکلا تو یکدم اپنے بید روم کی دہلیز پر رک گیا۔

لوٹنگ روم کا نقشہ ہی بدل چکا تھا۔ تمام چیزیں سیٹے سے رکھی تھیں۔ اینڈوور پلائس کو پانی دے کر ان کی جگہیں تبدیل کر دی گئی تھیں، میبلے برتن اب چپکے دستے اپنی جگہ پر پہنچ چکے تھے۔

میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا لوٹنگ روم میں آیا۔ مجھے مومو دائیں جانب کچن میں چولہے کے آگے کھڑی دکھائی دی تھی۔ آہٹ پر وہ مڑی ”آگے آپ؟ چلیں ناشتہ کر لیں۔“

اس نے چولہا بند کر کے فرائنک پین سے تلے ہوئے انڈے پلیٹ میں نکالے، دوسری پلیٹ میں توس رکھے اور کافی کے دو بھاپ اڑاتے گلوں کے ساتھ سیٹے سے ٹرے میں سجا کر لوٹنگ روم میں لے آئی۔

”یہ زیادہ شوگر والی آپ کی اور یہ کم شوگر والی میری۔“ مجھے میرا کپ تھما کر وہ مزے سے بولی۔

”اتنی سی دیر میں تم نے یہ سب کیسے کر لیا؟“ میری حیرت پر وہ مسکراتی اور شانے اچکا دیے ”بس کر لیا۔“

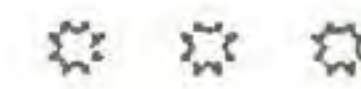
اس روز بتائیں کتنے عرصے بعد میں نے زائے دار ناشتہ کیا تھا جو مزہ اور ذائقہ مومو کے تلے ہوئے انڈے میں تھا، وہ مجھے پوری دنیا میں، سیون اسٹار ہوٹلز سے لے کر ڈرائیور ہوٹلز تک کہیں نہیں ملا تھا۔

اس کے بعد اکثر ہی وہ جاگنگ کے بعد میرے ساتھ گھر آجاتی اور نہ صرف یہ کہ میرے لیے ناشتہ بناتی بلکہ کبھی کبھار تو پورے ہفتے کے کپڑے بھی استری کر جاتی۔ پہلے

کپڑے میں استری کرتا تھا، برتن خود دھوتا تھا۔ نوکر کبھی رکھے نہیں کہ ان پر بھروسہ نہ تھا، صفائی البتہ ہفتے میں تین دن مسز کمال کی نوکرانی آکر کر جاتی تھی۔ ورنہ تو میں کھانا بھی (بد مزہ ہی سہی) خود ہی بناتا تھا۔ لیکن پھر مومو نے میرا ہر کام ہا محسوس انداز میں اپنے ذمے لے لیا وہ تو میرے پودوں تک کا خیال رکھتی تھی۔

اور پھر ایک دفعہ تو وہ ہفتے بھر کے لیے کسی شادی میں شرکت کرنے کے لیے کراچی چلی گئی۔ اس پورے ہفتے میں ’مومو پر بے حد انحصار کرنے کے بعد میں تو بالکل مفلوج ہو چکا تھا، کافی عرصے تک کچن سے دور رہنے کے باعث میں تو انڈے تلنا بھی بھول چکا تھا۔ میرے جوتے ’موزے‘ ٹالی، سب کچھ مومو رکھنے لگی تھی۔

اس ایک ہفتے میں مومو مجھے بہت یاد آئی تھی۔ مجھے پہلی بار احساس ہوا تھا کہ اس چھوٹی سی لڑکی کی میری زندگی میں کتنی اہمیت ہے، پھر بھی میں نے سوچا کہ اب وہ آگے گی تو اس سے کہہ دوں گا کہ میرے کام نہ کیا کرے، تاکہ میں اس کی غیر موجودگی میں مفلوج ہو کر نہ رہ جاؤں، مگر جب وہ ہنسی مسکراتی لڑکی واپس آئی، تو میں نے کچھ بھی کہنے کا ارادہ بدل ڈالا۔ اگر وہ میرا کام کر ہی دیتی تھی تو اس میں میرا فائدہ اور اس کی خوشی تھی، میں نے اسے مجبور تو نہیں کیا تھا۔ آخر میں بھی اسے ٹیوشن پڑھاتا تھا۔ میرے اندر کے خود غرض انسان نے مجھے اس سے کچھ بھی کہنے نہ دیا۔



”مومو تو کچن میں حیدر کے لیے سوپ بنا رہی ہے۔ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ تم بیٹھو، میں مومو کو بلاتی ہوں۔“

مجھے لاؤنج میں داخل ہوتے دیکھ کر آنٹی جو حیدر کے کمرے سے نکل رہی تھیں، شفقت سے مسکراتے ہوئے کہہ کر کچن کی جانب بڑھ گئیں۔

میں حیدر کے متعلق پریشان سا ہو کر اس کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ ٹکیوں کے سارے آنکھیں موندے بستر پر نیم دراز تھا، دستک پر آنکھیں کھول دیں۔ مجھے دیکھ کر نقابت سے مسکرایا۔

”اوصاف!“

”کیا حال بنایا ہے حیدر!“ میں تاسف سے اس کے پڑمڑہ اور کمزور چہرے کو دیکھتے ہوئے اس کے بید کے قریب

نرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

”ارے کچھ نہیں، معمول سا بخار ہے، مگر میری والدہ محترمہ اور۔۔۔“ اسی پل ہاتھ میں ٹرے لیے مومو اندر داخل ہوئی تھی۔

اس کو دیکھ کر حیدر کے لبوں پر غریہ مسکراہٹ بکھر گئی ”اور مس مہر النساء نے ہوا بنا کر رکھ دیا ہے۔“

”السلام، علیکم سر۔“ اس نے میز پر ٹرے رکھی اور جھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ کر پیالے اور چمچ سیٹ کرنے لگی۔ ”ہوا کسی نے نہیں بنایا یا! آپ بیمار ہیں اور مومو یہ روں کے ساتھ ایسے ہی کرتی ہے!“

وہ بڑے من مانتے انداز میں کہہ رہی تھی۔ اس کے بے بال شانوں پر بکھرے تھے، آج اس نے کڑھائی والی پوری آستین کا فیض شلوار پین رکھی تھی اور کندھوں پر لمبا سا دوشہ پھیلا ہوا تھا۔ آج وہ مجھے بڑی بڑی اور پہلے کی نسبت مختلف لگی تھی۔

”میری بیٹی بہت کیڑنگ ہے۔ جہاں جائے گی، جھٹیں اور خلوص بانٹے گی۔“ حیدر فخر سے اسے دیکھ رہا تھا۔

میں نے شرارت سے مسکرا کر مومو کو دیکھا۔ وہ عام لڑکیوں کی طرح شرمیلی یا گھبرائی نہیں، بلکہ پورے اعتماد سے مسکراتی تھی۔

”ہماری مومو ہر معاملے میں بہترین ہے۔“ میں نے بھی حیدر کی تائید کی۔

مومو نے ایک پیالہ حیدر کو تھمایا، جس نے سیدھے ہو کر ٹیک لگائی اور دو سرایا لہ اس نے میری سائیڈ والی نیبل پر رکھا۔

میں نے ایک چمچ سوپ کالیا۔ اس میں ساںز کم تھے۔ ”خبا“ وہ حیدر کے لیے غذائی اعتبار سے بنایا گیا سوپ تھا۔ میں نے خاموشی سے دو سرا چمچ لے لیا۔ حالانکہ میں تیز قسم کی چلی ساس ڈالنے کا عادی تھا۔

”یہ چلی ساس، سر!“ مومو نے چلی ساس کی بوتل چند لمحوں بعد مجھے لا کر دی، اور پھر خود ہی چند قطرے ڈال کر بوتل ٹرے میں رکھ دی۔ میں اسے بس دیکھ کر رہ گیا۔ پتہ نہیں اسے کیسے ہر بات کا بغیر کے علم ہو جاتا تھا۔

ہم دونوں کو سوپ سرو کر کے وہ حیدر کے سرانے آکر بیٹھ گئی۔ ”پاپا! ایک مشورہ دوں؟ آپ شادی کر لیں۔“

”مومو! حیدر کے لیے میں غفلت تھی۔“ ”پاپا! کر لیں ناشادی، میری فرزند کی بڑی بہن ہے، سارا

اتنی کیوٹ اور سوئیٹ ہے، ناوہ، اس کو ہر کام آتا ہے۔ آپ کے لیے پرفیکٹ ہے“ وہ بڑے جوش سے بتا رہی تھی۔ ”عمر کیا ہے؟“ حیدر نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے سوپ کا پیالہ سائیڈ پر رکھا۔

”تینا تینیں کی ہے؟“ مومو نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔ جواب میں حیدر نے گھور کر اسے دیکھا۔ ”مس مہر النساء بیمار ہیں، اور دماغ آپ کا چل گیا ہے؟“

”کیا ہوا پاپا؟“ وہ واقعی نہیں سمجھتی تھی۔ ”مہر النساء بی بی۔“ میں نے اسے مخاطب کیا۔ حیدر اور مجھے جب بھی اسے چھیڑنا ہوتا، ہم اسے مہر النساء کہہ کر پکارتے تھے۔

”آپ ایک غلط بات کر رہی ہیں۔ وہ لڑکی انیس سال کی ہے اور آپ کے والد ماجد چالیسویں سن کو کراس کر چکے ہیں۔“

”اس سے کیا ہوتا ہے سر! بندے کا ذہن ملنا چاہیے۔“ ”بہت کچھ ہوتا ہے مومو! عمر سے ہی تو سب کچھ ہوتا ہے۔“ حیدر سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ ”میں ایک شادی کر چکا ہوں، میری، ایک جوان بیٹی ہے، اگر ان لوگوں کو دولت کا

لاچ نہ ہو تو وہ کیوں اس کی شادی مجھ سے کریں گے؟“ ”پر آپ اتنے بیک لگتے ہیں، اور آپ اتنے پیئڈ سم بھی ہیں۔“ وہ بحث کرنے کے موڈ میں تھی۔

”بیک لگنے اور پیئڈ سم ہونے سے کچھ نہیں ہوتا۔ عمروں کے فرق کبھی نہیں ملتے، مومو!“ میں نے حیدر کی تائید کی۔

”ہمارے پیئمر صلی اللہ علیہ وسلم نے چالیس برس کی عمر میں بہت کم عمر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی شادی کی تھی اور وہ ایک مثالی شادی تھی۔“ اس کی بات پر میں لا جواب سا ہو گیا۔

”وہ اور بات تھی۔ میں اپنی بات کر رہا ہوں میری بات یاد رکھنا مومو، جو چیزیں ضروری ہوتی ہیں وہ ایک دن ختم ہو کر اپنی سابقہ بوزیشن پر آجاتی ہیں۔“

حیدر کا آجہ دو ٹوک تھا۔ مومو نے مدد طلب نگاہوں سے مجھے دیکھا، مگر میں نے شانے اچکا دیے۔ وہ مایوس سی ہو کر اپنے ناخنوں کو دیکھنے لگی۔



میں اتوار کے روز مومو کو ٹیوشن پڑھانے نہیں جاتا تھا،



پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیش کش

(WWW.PAKSOCIETY.COM)

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے آپ کیلئے پیش کیا۔

ہم خاص کیوں ہیں؟؟؟؟

یہ واحد ویب سائٹ ہے جہاں سے تمام ماہنامہ ڈائجسٹ، ناول، عمران سیریز، شاعری کی کتابیں، بچوں کی کہانیاں، اور اسلامی کتابیں ڈائریکٹ ڈاؤن لوڈ کرنے کے ساتھ ساتھ آن لائن پڑھ بھی سکتے ہیں۔



fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف

اگر آپ کو ویب سائٹ پسند آئی ہے تو پوسٹ کے آخر میں اپنا تبصرہ ضرور دیں۔

اپنا تبصرہ صرف پوسٹ تک محدود رکھیں۔ درخواست کے لئے رابطہ کا صفحہ استعمال کریں۔

اپنے دوست احباب کو بھی پاک سوسائٹی کے بارے میں بتائیں۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی انتظامیہ سے مالی تعاون کیجئے۔ تاکہ یہ منفرد ویب

سائٹ آپ کیلئے جاری رکھی جاسکیں۔

پاکستانیوں کے ویب سائٹ

WWW.Paksociety.Com



Library For Pakistan

گھر اس اتوار آئی نے بعد اصرار مجھے چائے پر انوائٹ کیا تھا۔ وہ مجھے کچھ لوگوں سے ملوانا چاہتی تھیں۔ میں پانچ بجے کے قریب وہاں چلا گیا۔

ڈرائنگ روم میں حیدر اور آئی کے علاوہ ایک خوش شکل مرد کے ہمراہ ایک خوبصورت سی ستائیس اٹھائیس سالہ لڑکی بیٹھی تھی۔

”یہ میرا کزن ہے حسان! ایک مانی نیشنل کمپنی میں کام کرتا ہے۔“ حیدر نے میرا تعارف ان سے کرایا۔ ”اور حسان! یہ میرا دوست اور بزنس پارٹنر برابر ریاض ہیں اور یہ ان کی بہن مس تانیہ ریاض ہیں۔ پرویشن کے اعتبار سے آرکینٹیکٹ ہیں اور ہمارے اگلے پروجیکٹ میں ان کی خاطر خواہ مدد ہمارے ساتھ ہوگی۔“

میں نے ایک رسمی مسکراہٹ ان کی جانب اچھٹی دی مجھے ان سے ملاقات کا کچھ کچھ مقصد سمجھ میں آ رہا تھا اور یقیناً ”آپ کو بھی آ رہا ہوگا۔“

وہ لوگ جتنی دیر بیٹھے رہے، میں خاموشی سے ان کی باتیں سنتا رہا۔ جس صوفے پر حیدر بیٹھا تھا اس کے پیچھے دیوار کی جگہ قید اور فریج وینڈو تھی جس نے پوری دیوار کی جگہ گھیر رکھی تھی۔ کھڑکی کے شفاف ٹیٹے کے اس پار مجھے لان دکھائی دے رہا تھا، مومو وہاں کھڑی حلیمہ کو کوئی کام کہہ رہی تھی۔ آج اس نے بہت پاری سی پنک کلر کی شلوار قمیض پہن رکھی تھی، دوپٹہ اس دن کی نسبت چھوٹا تھا اور گٹھے میں جھول رہا تھا۔ قمیض کے آستین بھی بہت چھوٹی تھی۔ جو اس پر بہت اچھی لگتی تھی۔

مہمانوں کے سامنے وہ چائے اور دیگر لوازمات سرو کرتے وقت ہی آئی۔ مجھے دیکھ کر اسے حیرت ہوئی۔ اس نے غلبا ”مجھے آتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ مجھے سلام کر کے وہ فوراً اندر چلی گئی اور تھوڑی دیر بعد اس کی واپسی براؤنیز کی ایک پلیٹ کے ساتھ ہوئی۔

”میں نے بنا کر رکھی تھیں آپ کے لیے، مجھے پتہ نہیں تھا کہ آپ آئے ہوئے ہیں ورنہ پہلے لے آتی۔“ لڑکی میں میرے سامنے براؤنیز کی پلیٹ رکھتے ہوئے اس نے آہستہ سے کہا ”میں زبردست مسکرایا۔“

آئی میرے قریب ہی بیٹھی تھیں، براؤنیز کی پلیٹ دیکھ کر انہوں نے مومو کو گھورا، وہ دوسری جانب دیکھنے لگی۔ آئی نے آہستہ سے مجھے مخاطب کیا ”کب سے کہہ رہی ہوں حلیمہ سے، براؤنیز بھی ساتھ لے آئے، مگر وہ کہہ رہی

تھی مومو بی بی نے براؤنیز کو ہاتھ بھی لگانے سے منع کیا ہے۔ اب سمجھ میں آیا، تمہارے لیے رکھی تھیں۔ مجھ سے پہلے پوچھ لیتی میری ملاؤ، تمہارے سر کو تو سچی میں انوائٹ کر چکی تھی۔“

اس نے براؤنیز صرف میرے لیے بنائی تھیں کیونکہ میں وہ بہت شوق سے کھاتا تھا۔ میں نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

”تھینک یو لنل گرل۔“ یہ پہلی بار تھا جب میں نے مومو کو تھینک یو بولا تھا، ورنہ ہمیشہ اس کی ہر خدمت کو میں فار گر انڈیل لیتا تھا۔

میرے شکریے پڑے مسکرائی۔ وہ لوگ چلے گئے تو حیدر بھی اٹھ گیا۔ اس کو کوئی ضروری کام تھا۔ حلیمہ برتن اٹھانے لگی۔ مومو قدرے تسلسل سے میرے اور آئی کے ساتھ بیٹھ گئی۔

حلیمہ چلی گئی تو آئی نے مجھے مخاطب کیا ”تمہیں تانیہ کیسی لگتی؟“

”ہوں۔۔۔ اچھی تھی۔“ میں نے گویا انجان بن کر کہا۔ ”تانیہ اور بابر چلی ہی میں پاکستان شفٹ ہوئے ہیں۔ بابر کالج کے زمانے سے حیدر کا دوست ہے۔ اس کے رشتے داروں میں تانیہ کے جوڑ کا کوئی لڑکا نہیں، بلکہ سچ کہوں تو اس کے رشتہ دار خاصے لالچی واقع ہوئے ہیں۔ اس نے حیدر سے تانیہ کے رشتے کے لیے کہا تھا۔ میرے اور حیدر کے ذہن میں صرف تمہارا نام آیا تھا۔ بولو، تم کیا کہتے ہو؟“

میں نے لمحہ بھر کو سوچا۔ ”سوچ کر بتاؤں گا، ویسے لوگ اچھے ہیں۔“

”اچھے کیا بہت اچھے ہیں۔ کینیڈا میں ان کا گھر سبین کے گھر کے قریب تھا۔“ آئی نے اپنی بھابی سبین کا نام لیا جو پچھلے کئی سالوں سے کینیڈا میں مقیم تھی ”سبین بتاتی ہے، تانیہ بہت اچھی اور شریف لڑکی ہے۔ ایشیائی کھانوں میں ماہر ہے اور بہت کچڑ ہے۔ وہ تو رشتے کی بات سن کر اتنی خوش ہوئی، کہتی تھی، میرا کوئی بھائی نہیں ہے ورنہ میں تانیہ کو اس کے لیے مانگ لیتی۔ بیٹے بھی میرے چھوٹے ہیں۔ آپ حسان کے لیے لے لیں اسے۔“

میں بے اختیار مسکرایا۔ سبین سے میرا براہ راست کوئی رشتہ نہیں تھا، وہ حیدر کی کزن تھی پھر بھی ہماری بات چیت ہوتی رہتی تھی۔

”کیسی ہے سہیل؟“

”بالکل ٹھیک ہے، ماشاء اللہ دو بجے ہیں اس کے۔ ابھی صبح ہی میں اس کے شوہر نے بہت برا کھرایا ہے۔ مجھ سے کہتی ہے، ”آپ اور مومو میرے پاس آجائیں، میرا اتنے بڑے گھر میں بلی نہیں لگت۔“

”ارے نہیں آنی! مومو کو کینڈا مت لے کر جائیں، میں بالکل مفلوج ہو کر رہ جاؤں گا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے مومو کو دیکھا، جو ہمارے سامنے والے صوفے پر بیٹھی تھی۔ وہ میری بات پر مسکرائی نہیں، بس بہت خاموش نظروں سے مجھے دیکھتی رہی۔ اس کی بھنویں تنی ہوئی تھیں اور وہ بالکل چپ تھی۔

”میں ذرا کچن کو دیکھوں۔“ آنٹی کسی کام کو یاد کر کے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

ان کے جانے کے بعد میں نے مومو کو دیکھا۔ وہ بالکل اسی طرح مجھے دیکھ رہی تھی۔ مجھے کچھ الجھن ہوئی۔

”مومو!“

”تو آپ داد کو سوچ کر تائیں گے اور۔۔۔ آپ کو وہ لوگ اچھے لگے ہیں!“ وہ ایک دم بہت کٹ دار لہجے میں بولی اس کی آواز میں بادل باغ غصہ تھا۔

”تانیہ اور باہر کی بات کر رہی ہو؟“ مجھے اس کے رویے پر حیرت ہوئی۔

”تو آپ داد کو سوچ کر تائیں گے“ وہ اسی دو ٹوک انداز میں بوجھ رہی تھی۔

”کیا ہوا ہے مومو؟“ میں نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔

”تو آپ شادی کر رہے ہیں؟“ اس کی آواز میں غصہ بھی تھا اور صدمہ بھی ”ہاں کتنی تو ہے نا! تو کر رہا ہوں مگر تمہیں کیوں غصہ آ رہا ہے؟“ میں اس کے رویے کی وجہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

کتنی ہی درود زخمی نگاہوں سے مجھے دیکھتی رہی۔ ”سرا!“

سرا! آپ کو وہ لڑکی نظر آگئی، جس کو آپ جانتے تک نہیں اور۔۔۔ اس کی آنکھوں کے گوشے جھگ گئے تھے ”اور ساڑھے پندرہ برس سے مومو کہیں نظر نہیں آئی آپ کو؟“

آج آپ مجھے چھوڑ کر کسی اور سے شادی کر رہے ہیں؟“ میرا دماغ بھگ سے اڑ گیا۔

”مومو!“ میں اتنی زور سے گرجا ”اس کی آنکھوں سے آنسو نکل کر گڑ گڑھکنے لگے تھے۔“

”تمہارا۔۔۔ تمہارا دماغ درست ہے؟ تمہیں پتہ ہے تم

نے کیا بات کی ہے؟“ میں ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔

مجھے اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

”مجھے پتہ ہے، میں نے صرف یہی کہا ہے کہ آپ مجھے چھوڑ کر اس تانیہ ریاض سے شادی کیوں کر رہے ہیں؟ کیا وہ مجھ سے بہتر ہے؟“ اس کا لہجہ شاک تھا۔

وہ اتنی آسانی سے وہ بات کر رہی تھی، جس کا تصور میں نے خواب میں بھی نہیں کیا تھا۔

”شٹ اپ مومو! جسٹ شٹ دی ہیل اپ!“ میں نے بے اختیار دروازے کو دیکھا ”اگر کسی نے تمہاری بکواس سن لی تو۔۔۔؟“ میرے خدا میں ایسی بات سوچ بھی نہیں سکتا تھا، اور تم۔۔۔ وہ گاڈ!“ بے یقینی ”دکھ، صدمہ“

استعجاب کے مارے میرے منہ سے کچھ نکل ہی نہیں رہا تھا۔

”ایسا کیا کہہ دیا ہے میں نے؟ آپ مجھے ساڑھے پندرہ سالوں سے جانتے ہیں، میرے کان میں اذان آپ نے دی تھی سرا! آپ تو مجھ سے واقف ہیں۔ آپ نے تو کہا تھا، آئی لوو مومو! اور آپ؟“ اس کی آنکھوں سے آنسو ایک دفعہ پھر گرنے لگے تھے ”اور آپ کیا میں اتنی بری ہوں کہ آپ مجھ سے شادی نہیں کر سکتے؟“

”بات برے اور اچھے کی نہیں ہے مومو! میں بھلا کیسے تم سے شادی کر سکتا ہوں؟ گاڈ!“ مجھے وہ فقرہ کہتے ہوئے بھی برا لگ رہا تھا۔ ”ہمارے درمیان ایک نیچر اور اسٹوڈنٹ سے بڑھ کر کوئی ریلیشن نہیں اور مجھے تم سے بہت محبت ہے مگر ایک چھوٹی سی دوست کی طرح لیکن تم نے اتنی بڑی بات کہہ دی بغیر کچھ سوچے مجھے۔ اگر حیدر کو علم ہو گیا تو۔۔۔ تم جانتی ہو، میں تمہارے باپ کی جگہ ہوں۔“

وہ ایک دم کھڑی ہو کر میرے سامنے آئی ”باپ کی جگہ؟“ اس نے غصے سے کہا تھا ”کیا کہا آپ نے؟ آپ میرے باپ کی جگہ ہیں؟ ان ساڑھے پندرہ برسوں میں کب آپ نے مجھے پٹا کیا؟ کب مجھے ”مائی چائلڈ“ کہہ کر مخاطب کیا؟ کب کہا کہ میں تمہارا باپ ہوں؟ آپ میرے باپ ہیں نہ باپ کی طرح ہیں، باپ صرف ایک ہوتا ہے، جو میرا آل ریڈی ہے۔“

”استار بھی باپ ہوتا ہے مومو!“ میں ڈپٹ کر بولا مگر وہ اسی نڈر آواز میں میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مجھ سے مخاطب تھی۔ ”بہت سے نیچرز اور اسٹوڈنٹس آپس میں

شادی کر لیتے ہیں، تو کیا دنیا ادھر سے ادھر ہو جاتی ہے؟ نہیں بابہ منہ بولے رشتے کچھ نہیں ہوتے اور ہمارے درمیان تو کوئی منہ بولا رشتہ ہے بھی نہیں۔“

”تم۔۔۔!“ شدید صدمے اور بے یقینی کی حالت میں، میں منھیاں پھینچ کر رہ گیا ”تم پاگل ہو گئی ہو۔ اتنی مولی مولی کتابیں پڑھ کر تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ یہ تمہاری عمر ہے شادی کی بات کرنے کی؟ افسانوں اور ناولوں نے تمہارے ذہن میں فٹور ڈال دیا ہے۔ اپنی عمر دیکھو اور اپنی باتیں دیکھو۔ تم تو سولہ برس کی بھی نہیں ہوئی ہو اور میں تم سے بائیس سال بڑا ہوں۔“

”عمر سے کچھ نہیں ہوتا، سرا!“ اس نے دائیں ہاتھ کی پشت سے آنسو پونچھے۔

”بہت کچھ ہوتا ہے، تم الیکٹرک پکلیکس کا شکار ہو۔“

”الیکٹرک پکلیکس؟ وہ کیا ہوتا ہے؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”ایک چھوٹی سی نفسیاتی بیماری جو کچھ لڑکیوں میں ہوتی ہے۔ دراصل یہ ایک لڑکی کا، اس کی ماں سے حسد کا نام ہے۔“

”ماں سے۔۔۔ حسد؟“ اس نے خائف سی ہو کر مجھے دیکھا ایک دم مجھے احساس ہوا، مومو نے تو ماں کو دیکھا ہی نہیں تھا۔

”در اصل جو لڑکیاں ذہنی طور پر جلدی میچور ہو جاتی ہیں نا کے اندر فغنی پلس مردوں کے لیے ایک پسندیدگی ڈیولپ ہو جاتی ہے۔ وہ بڑی عمر کے مردوں میں بیک وقت محبوب اور باپ دونوں کو تلاش کرتی ہیں۔ ایسی لڑکی کی شادی اگر اس کی عمر کے لڑکے سے کر دی جائے تو وہ ذہنی سطح پر ملنے کے باعث ناکام ہو جاتی ہے۔“

الیکٹرک پکلیکس ادھر ہی ختم نہیں ہو جاتا بلکہ جب وہ لڑکی میں پچیس برس کی عمر کو پہنچتی ہے تو معاملہ الٹ ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے سے آدھی عمر کے لڑکوں میں دلچسپی لینا شروع کر دیتی ہے۔ تم نے ضرور آئیٹوں ٹائپ خواہش کو بیک سے سیکرٹری رکھ کر ان کے آگے پیچھے پھرتے دیکھا ہو؟ تو یہی الیکٹرک پکلیکس ہوتا ہے۔“

وہ بکا بکا سی میری جانب دیکھ رہی تھی۔

”تو آپ؟“ آپ مجھ سے شادی نہیں کریں گے؟“

”بھروسہ شادی!“ میں چلا کر رہ گیا۔ ”میں مگر کبھی تم سے شادی نہیں کر سکتا، میرا تمہارا کوئی جوڑ نہیں یا اللہ!

میں تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔“ دکھ کے مارے مجھ سے کچھ بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔

”میں تو سمجھتی تھی آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں۔“ اس کی لابی پکلیکس ایک دفعہ پھر بھگ گئیں ”جیسے میں آپ سے کرتی ہوں۔“

”بچوں والی باتیں مت کرو مومو! جس کو تم محبت سمجھ رہی ہو وہ صرف ایک وقتی اور جذباتی انٹرکشن ہے۔ ذرا بڑی ہوگی تو تمہیں اس فضول اور احمقانہ خیال پر ہنسی آئے گی۔“ میرا لہجہ غصیلہ اور بے حد روکھا تھا۔

”آپ میری محبت کو فضول اور احمقانہ کہہ رہے ہیں۔“ اس نے دکھ سے میرا چہرہ دیکھا۔

”یہ محبت نہیں ہے مومو! یہ جذباتی انٹرکشن ہے۔ تمہیں بڑی عمر کا مرد اچھا لگتا ہے، کیونکہ تمہیں باپ کی محبت نہیں ملی۔ سارا قصور ہی حیدر کا ہے۔ اس نے تمہیں کبھی محبت دی ہی نہیں۔ اس لیے تم اپنے باپ کی عمر کے ہر آدمی میں اپنا باپ تلاش کرتی ہو۔۔۔ جانتی ہو میں روز تمہارے پاس کیوں آتا تھا؟ کیونکہ میں دیکھتا تھا حیدر تمہیں اگڑا کر رہا ہے۔ میں چاہتا تھا تمہاری ذات میں کہیں کوئی کمی، کوئی خلش نہ رہ جائے، اس لیے میں تمہیں توجہ دیتا تھا مگر تم نے کتنا الزام طلب لیا میری محبت کا، مومو! تم نادان ہو اور تم بے وقوف ہو۔“

”ہاں میں ہوں، میں نادان ہوں، میں بے وقوف ہوں، مگر میں نے اس دنیا میں سب سے زیادہ آپ سے محبت کی ہے۔ آپ سے سرا! لیکن۔۔۔ لیکن آپ کے خیال میں میں نفسیاتی مریض ہوں۔“

وہ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے سر کو تھامے صوفے پر گر سی گئی۔

”آپ کو میں ذہنی بیماریوں کا شکار لگتی ہوں۔ میری آپ کی زندگی میں کوئی اہمیت نہیں ہے۔“ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے ”آپ کو میں ہمیشہ غلط اور جھوٹی لگتی ہوں۔“ اس نے سر اٹھا کر آنسوؤں سے لبریز شکوہ کناں آنکھوں سے مجھے دیکھا۔

”مجھے پچھتاوا ہو رہا ہے کہ کیوں میں نے ساڑھے پندرہ برس تم پر ضائع کیے۔“ میری بات پر وہ اب پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔

”تم ایسی نکلوی کا ش مجھے علم ہوتا۔ آئی ہیٹ یو مومو۔ میں تمہاری شکل نہیں دیکھنا چاہتا۔“ میں نے میز سے چابی

انٹائی اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا ڈرائنگ روم سے نکل گیا۔ غصے، دکھ اور اضطراب سے میری عجیب کیفیت ہو رہی تھی۔ اگر حیدر کو اس کی باتوں کا علم ہو گیا تو کیا ہو گا؟ یہ سوچ سوچ کر میرا دماغ پھٹا جاتا تھا۔ میں نے ہمیشہ ایک استاد بن کر، ایک رہبر اور راہنما بن کر اس کے ساتھ برتاؤ کیا تھا اور وہ اس قسم کے خیالات پال لے گی، میں تو تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

پورچ کے قریب پہنچ کر ایک لحظہ کو رک کر میں نے ڈرائنگ روم کی کھڑکی کو دیکھا۔ قد آور کھڑکی کے شیشے کے اس پار مجھے مومو صوفے پر بیٹھی واضح دکھائی دے رہی تھی ڈرائنگ روم کی چیمٹ سے لٹکتے فانوس کی زرد روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔

اس کا دوشہ کندھے سے لڑھک کر نیچے گر چکا تھا۔ زرد روشنی میں اس کے دو دھیا بازو زرد لگ رہے تھے۔ اتنی دور سے بھی مجھے اس کا قدرے جھکا ہوا آنسوؤں سے تر چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس چہرے پر اتنا دکھ اور کرب تھا، میرا دل چاہا۔ میں رک جاؤں اور واپس جا کر اسے سمجھاؤں۔ اس روٹی ہوئی چھوٹی سی لڑکی کو چپ کراؤں۔ اس کو پہلی بار میں نے اس بری طرح سے روتے دیکھا تھا۔ اس کی بھوری آنکھوں میں کسی اندرونی ٹوٹ پھوٹ کے نشان دکھائی دے رہے تھے۔ اپنی عزت نفس اور اٹا کھونے کے بعد اس نے مجھے بھی کھو دیا تھا۔ وہ اندر سے ٹوٹ رہی تھی، اس کے آنسوؤں میں مجھے اس کی ٹوٹی بکھرتی ذات کی کرجیاں نظر آرہی تھیں۔ اسے میں نے بہت رلایا تھا، بہت دیکھی کر دیا تھا، مگر اس نے مجھ سے میرے حوصلے سے زیادہ مانگ لیا تھا۔ اس نے ناممکن بات کر دی تھی۔

میں اس کو چپ کراتا چاہتا تھا۔ اس کے آنسو پونچھتا چاہتا تھا، مگر۔ میں نے سوچا میں اسے رو تا چھوڑ کر چلا آیا۔

اس رات میں سو نہیں سکا۔ تمام رات بے چینی و اضطراب سے بستر کرو میں بدلتے زورے۔ مجھے صوفے پر بیٹھی بالوں میں انگلیاں پھنساے وہ روٹی ہوئی چھوٹی سی لڑکی یاد آرہی تھی اور مجھے پتہ تھا وہ بھی پوری رات نہیں سوئی ہوگی۔ صرف مومو کو میرے دل کی بات نہیں پتہ چل جاتی تھی۔ مجھے بھی کبھی کبھی اس کے دل کا حال پتہ چل جاتا تھا۔

صبح اٹھ کر میں نے فیصلہ کر لیا۔ فرار کا فیصلہ پتا نہیں یہ کس سے فرار تھا؟ خود اپنے آپ سے یا مومو سے؟ میں نے اپنا بیگ تیار کیا، آفس سے چٹھی لی اور آفس کے ایک ملازم سلطان کو گھر کی نگرانی کے لیے چھوڑ کر کراچی چلا آیا۔

میں کتنے دنوں کے لیے آیا تھا مجھے کچھ علم نہیں تھا۔ بس اتنا پتہ تھا کہ میں پیچھے کوئی بھی کنسٹنٹ نمبر چھوڑے بغیر بھاگ رہا تھا۔

کراچی سے میں ٹاورن ایریا ز چلا گیا۔ کتنے ہی بھٹے میں پھاڑوں اور چشموں کی خاک چھانتا رہا۔ ایک شہر سے دوسرے شہر اور دوسرے سے تیسرے میں نے وہ تمام خوب صورت مقامات دیکھ لیے، جو آج اپنی خوب صورتی کے لیے دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ اس وقت وہ بہت ہی غیر ترقی یافتہ تھے۔ سڑکیں خراب اور سہولیات ناپید تھیں، پھر بھی میں مگر مگر گھومتا رہا۔

چار ماہ گزر گئے میں گھر واپس نہیں گیا، نہ ہی وہاں فون کر کے حالات پتا کیے۔

پھر بانچواں مہینہ شروع ہونے سے قبل میں تھک ہار کر واپس اسلام آباد چلا آیا۔

واپس آیا تو گھر بہت اجڑا اجڑا سا لگا۔ سلطان صفائی کرتا دیتا تھا مگر اوپر سے دل سے نہیں۔ دل سے اور دل لگا کر تو میری چیزوں کا خیال صرف مومو رکھتی تھی۔

”سامان نکال لاؤ۔“ گاڑی کی چابی سے ڈگی کھول کر سلطان کو ہدایت دیتے ہوئے میں اندر آیا۔

لوٹنگ روم میں رکھے ان بڑے پلاٹس مرچھا سے گئے تھے میں نے کوٹ اتار کر صوفے پر پھینکا۔ میں بہت تھک چکا تھا۔ آخر کتنا بھاگ سکتا تھا مومو سے؟ بھاگنے سے بہتر تھا، میں اس کے پاس جاؤں اور اسے سمجھاؤں، یا پھر یوں ظاہر کروں جیسے کچھ بھی نہیں ہوا۔ وہ یقیناً چند دنوں میں اپنی اس نادانی کو بھول جائے گی اور ہماری زندگی دیکھی ہو جائے گی روٹیوں کی بے ساختگی تو واپس نہیں آسکتی تھی، مگر بہر حال میں یہ فیصلہ کر کے ہی لوٹا تھا۔

”بڑے دن لگا دیے آپ نے صاب!“ سلطان میرا بڑا والا بیگ اٹھا کر اندر آ گیا۔

”کوئی آیا گیا؟“ میں فریج کی جانب بڑھتے ہوئے سرسری انداز میں پوچھنے لگا۔

”ہاں جی، وہ انہوں نے۔“ اس نے جیسے داغ پر زور دیا۔ ”بھلا سا نام تھا، پتہ نہیں، یاد ہی نہیں رہا۔ مگر انہوں نے جی آپ کے جانے کے دو ماہ بعد تک روز شام صبح ادھر کے چکر لگائے تھے، پتہ نہیں جی کیا مسئلہ تھا ان کے چہرے پر بڑی پریشانی تھی، میں انہیں ہر بار بتاتا کہ صاحب کے آنے کا کچھ پتا نہیں ہے، پھر بھی وہ۔۔۔“

”کوئی پیغام دیا تھا اس نے؟“ میں نے آکر اس کی بات کائی۔

”ہاں۔۔۔ دو ماہ پہلے، جب انہوں نے آخری چکر لگایا تھا تو ایک کاغذ دیا تھا۔ لیکن ایک زبانی پیغام بھی بہت بار دیا تھا کہ آپ کا فون آئے تو بتا دوں، مگر جی آپ کا فون ہی نہیں آیا، اس لیے۔۔۔“

”کیا پیغام دیا تھا؟“ میں نے پانی کی بوتل لیوں سے ہٹاتے ہوئے قدرے بے چینی سے استفسار کیا۔ پتہ نہیں مومو نے میرے لیے کیا پیغام چھوڑا تھا۔

”وہ جی انہوں نے کہا تھا کہ آپ کو بتا دوں، میں نے باہر صاحب کو اپنی بیٹی کی وجہ سے انکار کر دیا ہے۔ اتنی بار انہوں نے مجھے بتایا کہ مجھے یاد رہی گیا۔“

میرے ہاتھ سے پانی کی بوتل چھوٹے چھوٹے پٹی۔

”کون؟ حیدر۔۔۔ حیدر آیا تھا؟ صبح شام ادھر حیدر آتا رہا تھا؟“ میں پھٹی پھٹی نگاہوں سے سلطان کو دیکھ رہا تھا۔

”ہاں جی۔۔۔ یہی نام تھا ان کا۔“

میرے قدموں سے آہستہ آہستہ زمین سرک رہی تھی

”کوئی۔۔۔ کوئی لڑکی نہیں آئی؟“

”نہ جی لڑکی تو کوئی نہیں آئی۔ وہی حیدر صاحب آئے تھے ایک خط دے گئے تھے، پھر اس کے بعد نہیں آئے۔“

دو منٹ بعد وہ خط لے آیا۔

میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ خط کھولا۔ وہ حیدر کی ہینڈ رائٹنگ تھی۔

”حسان! دو ماہ پہلے مومو میرے پاس آئی تھی جس روز میں نے تمہیں باہر سے ملوایا تھا، اس رات وہ میرے پاس آئی تھی اور جانتے ہو، وہ رو رہی تھی، حسان! میری بیٹی رو رہی تھی۔ میری مہر النساء رو رہی تھی۔“

جانتے ہو اس نے مجھ سے کیا کہا؟ اس نے کہا ”آپ نائیہ آنٹی کو انکار کر دیں میں نے ہمیشہ خود کو سر کے ساتھ

دیکھا ہے، مجھے سر سے الگ مت کریں۔“ اور اس نے یہ بھی کہا ”آپ بہت برے ہیں بابا، آپ اپنی مومو سے اس کی سب سے قیمتی شے چھین رہے ہیں۔“

وہ رو رہی تھی حسان! اس نے روتے پلکتے زندگی میں پہلی بار مجھ سے کچھ مانگا تھا۔ میں اپنی مومو کو کیسے انکار کر سکتا ہوں؟ میں اسے انکار کر رہی نہیں سکا، مجھے میری مومو بہت پیاری ہے۔

وہ کتنی ہے سرکتی ہیں میں پاگل ہوں۔ حسان! میری بیٹی پاگل نہیں ہے۔ تمہارے معاملے میں وہ ہمیشہ سے ایسی ہے۔ جب اس نے 8th کلاس میں پوزیشن لی تھی تو میں نے اسی روز اسے گولڈ کے ٹاپس دیے تھے۔ وہ خوش ہوئی تھی، مگر اس نے وہ ٹاپس کبھی نہیں بنے۔ پھر دوسرے میں تم آئے اور تم نے اسے گھڑی دی وہ اپنی خوش ہوئی، تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ اس نے اپنی پوری کلاس میں اپنا شاندار رزلٹ کارڈ نہیں، بلکہ وہ گھڑی، گھائی تھی وہ گھڑی آج بھی اس کے ہاتھ میں ہوتی ہے وہ بھول آج بھی اس کی کتابوں میں محفوظ پڑے ہیں اور تم کہتے ہو، میری مومو پاگل ہے؟

وہ کتنی ہے سرکتی ہیں، تمہیں حیدر پیار نہیں کرتا۔ حسان! میں تو اسے ہمیشہ سے پیار کرتا ہوں۔ تم کتنا جانتے ہو میرے اور مومو کے ریلیشن کے بارے میں؟ تم

روز صرف ایک گھنٹہ ہمارے گھر آتے ہو، صرف ایک گھنٹہ اس لیے تمہیں علم نہیں ہے کہ میں اور مومو روز رات بارہ ایک بجے تک بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں، اس کو گڈ

نائٹ کہہ کر میں اپنے کمرے میں جاتا ہوں۔ مومو جانتی تھی، تم یہ سمجھتے ہو۔ اس کے دل میں کیس نہ کہیں یہ خوف تھا کہ تم اس کو محبت اور توجہ بھی اسی لیے دیتے ہو

اسی لیے اس نے کبھی تمہاری غلط فہمی دور کرنے کی کوشش نہیں کی۔ مومو اندر سے بہت بزدل لڑکی ہے، وہ بہت سے لوگوں کو بہت ساری باتیں اس ڈر سے نہیں بتاتی کہ کہیں

وہ اس سے محبت کرنا چھوڑ دیں، ورنہ میں نے تو سونیا سے بھی زیادہ محبت مومو سے کی ہے اور جانتے ہو، اس رات وہ رو رہی تھی۔ میری سونیا، میری مہر النساء رو رہی تھی۔

میں باپ ہوں، میری مجبوری کو سمجھو میں نے اس سے وعدہ کیا ہے کہ میں اس کو اس کے سر سے الگ نہیں کروں گا۔ میں روز تمہارے گھر کے چکر لگاتا ہوں، مگر تم بھاگ رہے ہو، تم مومو اور حیدر سے بھاگ رہے ہو۔ اگر تم نے

خواہن: 150 اگست 2003

خواہن: 151 اگست 2008

فرار ختم نہ کیا تو مومو کچھ بہت غلط کر ڈالے گی اور میں اسے روک بھی نہیں سکوں گا۔
واپس آجاؤ حسان میں مومو کو روکتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔

حیدر
میں نے اس خط کو اتنی دفعہ پڑھا کہ اس کے الفاظ میرے ذہن پر نقش ہو کر رہ گئے۔ مجھے لگا مومو میرے سامنے صوفے پر بیٹھی ہے۔ اس کی کنیاں اس کی گود میں رکھے کشن پر ہیں، اس کے آرنسنگ ہاتھوں کی خوب صورت انگلیاں اس کے بالوں میں پھنسی ہیں، اس کے آنسوؤں سے تر چہرے پر فانوس کی زرد روشنی پڑ رہی ہے اور وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہی ہے۔
میں ایک دم بے چین سا ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اگر حیدر اسے روٹا ہوا نہیں دیکھ سکتا تھا تو حسان بھی اسے روٹا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں نے زندگی میں سب سے زیادہ محبت مومو سے کی تھی مگر میں اس سے شادی نہیں کر سکتا تھا۔ میرے نزدیک یہ ایک غیر فطری بات تھی۔

”میں اسے منالوں گا، میں حیدر کو بھی سمجھا لوں گا۔“
یہی سوچ کر میں اٹھ کھڑا ہوا مجھے لگا شاید وہ ابھی تک اپنے ڈرائنگ روم کے صوفے پر بیٹھی رو رہی ہو۔
اسی وقت گاڑی تیز رفتاری سے دوڑاتے ہوئے بہت سی امیدیں اور خدشات لے کر میں مومو کے گھر گیا تھا۔ اس کے گیٹ کے باہر ایک جھنگ سے میں نے گاڑی روکی اور باہر نکل کر بے یقینی سے گیٹ پر لگے تالے کو دیکھا۔
دباں بالا کیوں لگا تھا؟

میں نے بے اختیار نیل بجائی اور پھر بجاتا چلا گیا، مگر کسی نے دروازہ نہ کھولا۔ زمین اور آسمان میری نگاہوں کے سامنے گھومنے لگے تھے۔ حیدر مومو آنٹی سب کدھر چلے گئے تھے؟

جب چھٹی پر کسی نے دروازہ نہ کھولا تو میں نے گیٹ ہاتھوں سے بجانا شروع کر دیا۔

”مومو... مومو!“ میں اسے آوازیں دے رہا تھا، مگر وہ نہ آئی گیٹ پیٹنے کی آواز سن کر ساتھ والے گھر سے مسز ہاشمی کی بڑی ہونٹل آنکھیں۔ ان کو دیکھ کر مجھے کچھ حوصلہ سا ہوا۔

”حیدر اور اس کے گھر والوں کے بارے میں کچھ علم ہے آپ کو؟ میں کافی عرصے بعد آیا ہوں یہ سب کدھر

چلے گئے ہیں؟“

”حیدر صاحب کی تو ڈیوٹی ہو گئی ہے۔“

میں کرنٹ کھا کر چیخے ہٹا تھا۔ کسی نے میرے قدموں تلے سے زمین کھینچ لی تھی۔

”کک... کیا کہا آپ نے؟ حیدر کی ڈیوٹی؟“ مجھے اپنی سماعتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ یقیناً کوئی بھیانک خواب تھا مجھ پر حیدر کیسے مر سکتا تھا؟

”دو مہینے پہلے انہیں دل کی تکلیف ہوئی تھی، ایسویٹس انہیں اسپتال لے کر جا رہی تھی کہ راستے میں ایک سبڈنٹ ہو گیا۔ وہ موقع پر ہی ایک سپائر ہو گئے تھے۔“ وہ تاسف سے بتا رہی تھیں۔

میں پھٹی پھٹی نگاہوں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ میرا دوست، میرا کرن، میرا حیدر، جو مجھ سے اپنی بیٹی کی خوشیاں مانگنے پر روز میرے گھر آتا تھا، جو کہتا تھا میں مومو کو روٹے نہیں دیکھ سکتا، وہ حیدر اب نہیں رہا تھا وہ مر گیا تھا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔

”اور ان کی بیٹی اور والدہ؟“ کتنی ہی دیر بعد میں بولا تو مجھے اپنی آواز کسی گہری کھالی سے آتی سنانی دی تھی۔

”وہ تو چلے گئے۔“

”چلے گئے؟ کدھر چلے گئے؟“ مجھے لگ رہا تھا، میں پاگل ہو جاؤں گا۔

”ان کی والدہ کی کوئی بھانجی آئی تھیں کینیڈا سے، وہ ان دونوں کو اپنے ساتھ لے کر کینیڈا چلی گئیں۔ ابھی کل ہی گئے ہیں وہ لوگ۔“

”وہ واپس... واپس کب آئیں گے؟“ کسی امید کے تحت میرے لبوں سے نکلا تھا۔

”واپس تو نہیں آئیں گے، وہ تو ہمیشہ کے لیے چلے گئے ہیں۔“

میں تھکے تھکے قدموں سے اپنی گاڑی کی جانب پلٹ آیا۔ میرا دماغ درد سے پھنسا جا رہا تھا۔ میرے ہاتھ میرا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ سب کچھ جیسے خواب کی سی کیفیت میں ہو رہا تھا۔

میرے پیچھے اتنا کچھ ہو گیا اور میں بے خبر رہا میں اتنا سنبھل تو نہیں تھا، اور مومو وہ چلی گئی؟ وہ کیوں چلی گئی؟ میں کیسے رہوں گا مومو کے بغیر؟

محبت تو میں نے اس سے بہت کی تھی مگر میں احساس کمتری میں مبتلا تھا۔ اپنی بڑھتی عمر کے احساس کمتری میں

بمبتلا تھا۔ اپنی بڑھتی عمر کے احساس کمتری میں، میں نہیں چاہتا تھا کہ لوگ ہم پر نہیں ہمارا مذاق اڑائیں میں ڈرتا تھا، میں بزدل تھا مومو کو میں نے اس وقت کہا تھا کہ ”میں تو ایسا تصور بھی نہیں کر سکتا، مگر میں نے ایسا تصور کیا تھا، میرے دل میں بھی چور تھا۔ اگر چور نہ ہوتا تو میں بھاگتا کیوں؟“

اور حیدر... اس نے جان دے دی؟ اسے دل کی تکلیف کب سے شروع ہوئی تھی؟ اس رات سے جب اس نے اپنی بیٹی کو روٹے دیکھا تھا، یا پھر اس روز سے جب وہ میری جانب سے مکمل طور پر مایوس ہو چکا تھا؟

مومو ٹھیک تھی، میں غلط تھا، وہ صحیح کہتی تھی کہ میں اس سے کسی ہی محبت کر رہا تھا، جیسے وہ مجھ سے کرتی تھی، مگر میں عدم تحفظ کا شکار تھا بزدل اور خود غرض اور سب لوگوں کی طرح۔

اور مومو، جو اپنی تمام تر بزدلی کے باوجود مجھ سے زیادہ بہادر تھی، زندگی میں پہلی دفعہ مجھ سے ناراض ہو کر بہت دور جا چکی تھی۔



مومو مٹی تو اپنے ساتھ زندگی کی رنگینیاں، روشنیاں اور نخلیاں بھی لے گئی میری ذات، میرا وجود؟ میری زندگی، سب کچھ بہت بے کیف اور بے رونق سا ہو کر رہ گیا تھا۔

روز شام چھ بجے میں اپنی گاڑی عادتاً ”مومو کے گیٹ کے سامنے لے جا کر بارن بجانا“ پھر چائیک مجھے یاد آتا کہ اب اندر سے کوئی چھوٹی سی لڑکی نکلی کر یہ نہیں کہے گی کہ ”سرا! آج میرا میٹ ہے یا جلدی آئیں سر! میں نے آپ کے لیے چکن شالک بنایا ہے در کریں گے تو وہ ٹھنڈا ہو جائے گا اور پھر آپ نہیں کھائیں گے“ کیونکہ وہ لڑکی تو جا چکی تھی۔

میں بوجھل دل لیے واپس آجاتا، شام پھر اس کے گھر چلا جاتا۔ پھر یہ بھول ہر شام ہونے لگی۔ ساڑھے پندرہ برس کی عادتیں انہی آسانی سے تو نہیں جاتیں۔

جیسے ہر شام بندہ اپنے گھر واپس لوٹتا ہے، اسی طرح ہر شام میں اس کے گھر جاتا تھا، کتنے ہی مہینے بیت گئے اور مجھے یقین آ گیا کہ وہ مڑی ہوئی پلکوں والی لڑکی وہاں سے جا چکی ہے۔ جب یہ یقین آ گیا تو میں وہ بھول جان بوجھ کر دہرائے نکلا۔

دو برس تک یہ سلسلہ چلتا رہا، میں نے امیدیں لے کر اس کے گھر کے دروازے پر جانا چھوڑ دیا۔ میں نے گھر میں ناشتہ کرنا بھی چھوڑ دیا، کیونکہ وہ مجھے مومو کی یاد دلاتا تھا۔ میں نے رات کا کھانا کھانا بھی چھوڑ دیا کیونکہ وہ مجھے صرف مومو کے ہاتھ کا پسند تھا۔ میں نے اونٹنک روم میں ان ڈور پلائٹس رکھنے بھی چھوڑ دیے، میں نے بہت کچھ چھوڑ دیا، بس اس بھوری آنکھوں والی نازک سی لڑکی سے محبت کرنا نہ چھوڑ سکا۔ یہ میرے اختیار میں نہ تھا۔

پھر میں نے اپنی بے رونق، پھٹکی زندگی میں رنگ بھرتا چاہا۔ وہ رنگ جو مومو کو پسند تھے، جن کو وہ اپنی خوب صورت انگلیوں سے کینوس پر بکھیرنا چاہتی تھی، ہاں وہی رنگ میں نے اپنی زندگی میں بھرنے چاہا۔

پینٹنگ میرا بچپن کا شوق تھا۔ جب میں اسکوئی میں تھا تو چلائی ایلمینٹی کے زیر النقاد ایک پینٹنگ کمپیشن میں میری بنائی گئی ایک تصویر کو پہلا انعام اور مجھے بطور اعزاز آٹھ سو ڈالر دیے گئے تھے۔ وہ ڈالر میری بچپن کے خود رکھ لیے تھے، اور وہ پینٹنگ مجھے کبھی واپس نہیں ملی کیونکہ وہ میرے پرنسپل کی بیٹی کو بہت پسند آگئی تھی۔ سو پرنسپل صاحب نے وہ اسے گفٹ کر دی۔

کوئی انسان یونہی دنیا سے بے اعتبار، بدگمان اور شکی مزاج نہیں بن جاتا یہ اس قسم کی چھوٹی چھوٹی باتیں ہوتی ہیں، جو ہم پر بہت گہرا نفسیاتی اثر چھوٹی ہیں۔

میں اس واقعے سے اتنا دل برداشتہ ہوا کہ اپنا برش توڑ دیا، ایزل اور کینوس جلا ڈالے اور رنگ پھینک دیے، یوں میں نے وقتی طور پر اپنے اندر کے آرٹسٹ کو مار ڈالا۔

مگر رنگوں اور نخلیوں کا دس مجھے واپس اپنی جانب بلاتا رہا تھا۔

اور پھر اس روز جب میں نے مومو کی مصوری دیکھی تو مجھے ایک انجانا سا سکون ملا تھا۔ اسی لیے تو میں اسے پینٹر بننے کے لیے کہتا تھا اور مجھے یقین تھا کہ وہ اپنے اندر کے آرٹسٹ کو باہر نکال ہی لائے گی، وہ کینیڈا جا کر آرٹ ہی پڑھے گی۔ مومو کی انگلیاں یہ بات کہتی تھیں اور میرا دل یہ بات کہتا تھا۔

مومو کے جانے کے تیسرے برس میں نے ایک آرٹ اکیڈمی شام چھ سے سات تک جوائن کر لی۔ جو وقت میں پہلے مومو کو دیتا تھا اب مومو کے رنگوں کو دے رہا تھا۔

کبھی کبھار، کینوس پر رنگ بکھیرتے ہوئے میں اپنے

برش کو انگلیوں کے درمیان تھام کر سوچتا تھا کہ شاید مومو بھی اسی کمپنی اور ساخت کا برش استعمال کرتی ہو شاید وہ بھی رنگ کرتے وقت گردن کو یونسی ترچھا کرتی ہو شاید اس کے ہاتھوں پر بھی میری طرح Pastal طرز رنگ جاتے ہوں مگر اس کے ہاتھ تو بے حد خوب صورت تھے اور میرے ہاتھ میری شکل و صورت کی طرح عام سے ہی تھے۔

دو سالوں تک مختلف اکیڈمیوں میں آرٹ پڑھنے اور سیکھنے کے بعد میں نے مانی نیشنل فرم کی وہ جاب چھوڑ دی جس کی خواہش لاکھوں نوجوان کرتے تھے مگر مجھے کوئی خواہش نہیں تھی یا پھر اب رہی نہیں تھی۔ جاب چھوڑنے کے بعد میں نے اپنے بینک بیلنس اور کچھ سیونگز کو ملا کر ایک جگہ کمرہ حاصل کر کے اپنی آرٹ اکیڈمی کھول لی۔

میری بینکنگز اور میری اکیڈمی اب میرے اخراجات پورے کرنے کے لیے کافی تھیں میں خوش نہیں تھا مگر مطمئن اور پرسکون ضرور تھا۔

میری آرٹ اکیڈمی کے دوسرے بیچ میں ایک بارہ سالہ لڑکی بھی سیکھنے آئی تھی۔ اس کو دیکھ کر مجھے پتہ نہیں کیوں مومو یاد آ جاتی تھی۔ اس کا نام ماریہ تھا اس کے ہاتھ اور انگلیوں کی ساخت بالکل مومو جیسی تھی اور اس کی بھوری آنکھیں مڑی ہوئی پلکیں اور لمبی سی فرنیچ برید بالکل مومو کی طرح تھیں۔ چہرے کے نقوش رنگت قد وہ ہر لحاظ سے مومو سے مختلف تھی مگر پھر بھی دونوں میں بہت مماثلت تھی۔

ماریہ باتیں بھی مومو کی طرح کرتی تھی۔ دوسروں کی ہمدردی میں پھل جانا کسی کے غم کو اپنا سمجھ لینا اور خود کو فوراً قربانی کے لیے پیش کر دینا۔ وہ مومو سے بہت ملتی تھی۔

جب اس نے اسکیج بنانا سیکھا تو پہلا اسکیج ایک پولیٹیکل لیڈر کا بنایا اس کا وہ اسکیج ہاتھ میں پکڑے مجھے مومو جی طرح یاد آئی تھی۔

وہ بھی تو ایسی ہی تھی۔ لیڈر ز اور سیاست دانوں کو پسند کرنے والی اور ایسی لڑکیوں کو میں بے وقوف کہا کرتا تھا۔ جانے کیوں وہ اسکیج دیکھتے ہی میرے لبوں سے مومو نکلا تھا۔

”جی سر!“ ماریہ جو میرے سامنے کھڑی تھی قدرے

حیرت بھری تابعداری سے بولی۔

”میں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور پھر دھیرے سے مسکرایا کچھ نہیں“

”سر! آپ کو کیسے پتہ چلا کہ میرا ایک نیم مومو ہے؟“

اس نے قدرے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

مجھے حیرت کا بخجہ کا لگا مگر پھر میں سنبھل کر مسکرا دیا

تمہاری شکل پر لکھا ہے ماریہ!

”میری شکل پر؟“ وہ میری بات پر حیران ہوتی ہوئی اپنی جگہ پر بیٹھ گئی۔

اس روز کلاس کے بعد جب میں اپنی چیزیں سمیٹ رہا تھا ماریہ میرے پاس چلی آئی۔

”سرا ایک بات مانیں گے؟“

”ہاں بولو بیٹا!“ میں نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

اس نے لمبے جینز کے اوپر آدھے بازوؤں والی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ بال ہمیشہ کی طرح فرنیچ چوٹی میں مقید تھے یہ حلیہ تو کسی اور کا بھی ہوتا تھا میں یاد نہیں کرنا چاہتا تھا۔

”سر! آپ میرا پورٹریٹ بنائیں گے؟“

”شیورنگیوں نہیں۔“ اس کے ہچکچاتے انداز پر میں مسکرایا۔

”کل اکیڈمی ٹائم کے بعد ایک ٹھنڈا ایکسٹرا بیٹھ جانا۔“

”کتنی سننگز ہوں گی سر؟“ وہ مجھے بالکل مومو کی طرح سرکتے ہوئے R کو silent کرتی تھی۔

”دو یا تین مگر میں گارنٹی نہیں دیتا کہ وہ بہت اچھی ہو گی۔“

”ارے نہیں سر! آپ تو بہت اچھی بینکنگز بناتے ہیں۔“ وہ ہنس کر بولی۔ اس طرح مجھے ارے نہیں سر کون کہا کرتا تھا میں یاد نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اگلی شام اس کو اسٹول پر اپنے سامنے بٹھا کر میں نے جب اس کا پورٹریٹ بنانا شروع کیا تو آغاز آنکھوں سے کیا اس کی آنکھیں بناتے بناتے میرے ذہن کے پردوں پر وہ منظر لہر گیا جب مومو میرے سامنے ٹانگ پر ٹانگ رکھے ناعمہ کے لاؤنج میں آرام سے بیٹھی تھی اور اٹھنے کے موڈ میں نہ تھی۔

ایک سنگ میں پورا پورا پورٹریٹ مکمل کرنے کے بعد میں یہ جانتے ہوئے بھی پرسکون تھا کہ میں نے ماریہ کا نہیں مومو کا پورٹریٹ بنادیا تھا۔

”بن گئی سر؟“ ایک گھنٹے سے اسٹول پر ماڈل بن کر بیٹھی

ہارے محل کر میرے پاس آئی۔ تصویر پر نگاہ پڑتے ہی اس نے حیرت سے میری جانب دیکھا۔

”کیسی بنی ہے؟“

”بہت اچھی ہے سر! مگر اس میں میں کہاں ہوں؟“

اس کے انداز پر میں بے اختیار ہنس پڑا۔

”تمہاری کل بنا دوں گا یہ کسی اور کی ہے۔“

”کس کی ہے؟“ اپنی مایوسی بھلائے وہ اشتیاق سے پوچھنے لگی میں نے برش کے کنارے کولوں تلے دبائے کچھ دیر کو سوچا ”مومو کی ہے۔“

”مومو کون؟“ اس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔

”ہے ایک لڑکی۔“ میں اداس سا ہو گیا۔ ”مجھے چھوڑ کر جانی ہے۔“

”کدھر؟“ وہ بھی اداسی سے پوچھنے لگی۔

”کینڈا۔“

”کیوں سر؟“ وہ میرے پاس رکھے اسٹول پر بیٹھ گئی۔

”میں نے اسے ناراض کر دیا تھا۔“ میں سر جھکائے

بنانے لگا۔

”تو آپ منالیں نا؟“

میں نے سر اٹھا کر مغموم انداز میں مسکراتے ہوئے

سے دیکھا ”مجھے اس کو ماننا نہیں آتا۔“

”کیوں سر؟“

”میں نے اسے کبھی منایا ہی نہیں۔“

”تو اب منالیں نا؟“

”کیسے؟“ میں نے امیرا اٹھائے۔

”کہہ دیں آئی ایم سوری سو سپل!“ اس نے آرام سے کہہ دیا۔

”ہر بات آئی ایم سوری سے حل نہیں ہو جاتا ماریہ!“

”سر! مجھے پوری کلاس مومو کہتی ہے آپ ماریہ کیوں کہتے ہیں؟“ وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھ رہی تھی۔

”میری صرف ایک ہی مومو تھی۔ بہت اچھی فرینڈ تھی۔“

”میری۔ تمہاری کوئی فرینڈ ہے ماریہ؟“ میں نے یونسی پوچھا۔

اس نے افسردگی سے نفی میں سر ہلا دیا۔ ”میری کوئی فرینڈ نہیں ہے۔“

”ارے وہ کیوں؟“ میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

وہ میری بات کا جواب دینے کے بجائے اٹھ کر چلی گئی۔ مومو بھی ایسے ہی اٹھ کر چلی جاتی تھی میں کبھی مومو کے پیچھے نہیں گیا تو ماریہ کے پیچھے کیسے جاتا؟

اگلی شام مجھے ماریہ بہت چپ چپ لگی تھی۔ چھٹی کے وقت جب سب نپکے جانے لگے تو میں نے اسے اپنے پاس بلالیا۔

”ادھر آؤ۔“

وہ جو اپنا پنک کٹر کا بیگ لے کر باہر کھلنے والے دروازے کی جانب بڑھ رہی تھی میری بات پر سر جھکائے میرے سامنے آکھڑی ہوئی۔

”بیٹھو ادھر!“ وہ بیٹھ گئی تو میں نے پوچھا۔

”ماریہ! تمہاری مٹی کب فوت ہوئی تھیں؟“ اس کے آنے سے پہلے میں نے فاطمہ سے جو ماریہ کے گھر کے قریب رہتی تھی اس کے متعلق پوچھا تھا۔

وہ چند لمحے میری جانب خاموشی سے دیکھتی رہی پھر بولی۔

”جب میں دس سال کی تھی تب!“

”اور تمہارے فادر؟ وہ تمہارا خیال کرتے ہیں؟“ مجھے پتا نہیں کیوں حیدر یاد آتا تھا۔

”وہ مجھ سے زیادہ سارہ ماما میں انٹرنڈ ہیں۔ سارہ ماما میری خالہ ہیں۔ وہ کئی سالوں سے میرے بھانے پپا سے ملنے ہمارے گھر آتی رہتی ہیں وہ پپا سے شادی کرنا چاہتی ہیں اور انہیں لگتا ہے کہ میں چھوٹی بچی ہوں اور کچھ نہیں سمجھتی چھوٹی عمر میں بڑے بڑے غم مہر اقساء اور ماریہ کو بہت جلدی سنجیدہ اور پیچور کر دیتے ہیں۔“

”اور پپا ان سے شادی کر لیں گے؟“

”جی یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں خوف سمٹ آیا۔“

”تمہیں اچھی نہیں لگتی سارہ ماما؟“ میں اس کے چہرے کو بڑھ رہا تھا۔

”بالکل بھی نہیں۔ وہ مجھے گھر سے نکال دیں گی۔“

”ارے نہیں ماریہ! گھر سے کیوں نکال دیں گی؟“

تمہارے پپا کا گھر ہے اور بھلا گھر سے کدھر نکالیں گی؟“

اس نے یقیناً ”سنڈریلا ٹائپ کی بہت ساری کہانیاں پڑھ رکھی تھیں۔“

”آپ کو نہیں پتہ ہے ایک جگہ وہ بڑبڑاتی تھی۔“

گاڑی کے ہارن کی آواز آئی تو ماریہ اپنا بیگ سنبھال کر

اٹھ کھڑی ہوئی۔

پھر چند ہفتوں بعد ماریہ نے مجھے بتایا ”سر! بابا نے سارہ ماما سے شادی کر لی ہے۔“ وہ ان دنوں بہت ڈری سہمی سی رہنے لگی تھی۔ میں نے اسے امید دلائی کہ سب ٹھیک ہو جائے گا تب اس نے مجھ سے ایک فرمائش کی۔

”سر آپ میرے گھر آئیں۔“

اور میں نے ہائی بھرلی ”ہاں ماریہ میں آؤں گا تمہارے گھر اور تمہارے بابا سے بات کروں گا کہ وہ سارہ ماما سے زیادہ تمہیں امپورٹس دیا کریں۔“

وہ خوش ہو گئی۔

ہائی تو میں نے بھرلی مگر پھر ان دنوں کسی دوست کی شادی میں شرکت کے لیے مجھے کراچی جانا پڑ گیا۔

میں نے چار روز کے لیے اکیڈمی کی چھٹی کر دی۔ چار بے حد مصروف دن گزارنے کے بعد جب میں اکیڈمی آیا تو میری پوری کلاس موجود تھی سوائے اس کھڑکی کے ساتھ والی کرسی کے وہ کرسی خالی تھی۔

یہ ماریہ کی پورے سال کی پہلی چھٹی تھی اس لیے میں نظر انداز کر گیا لیکن جب وہ اگلا پورا ہفتہ نہ آئی تو مجھے فکر ہوئی۔

”یہ ماریہ کیوں نہیں آ رہی؟“ میں نے قدرے بلند آواز میں کسی کو مخاطب کیے بغیر کلاس سے پوچھا تھا۔

”پتا نہیں سر!“

”پتا نہیں سر!“ کی صدا میں بلند ہوئیں۔

”سر آئی تھنک!“ اس کی اسٹیپنڈی نے اسے گھر سے نکال دیا ہے۔ ”قاطمہ“ ماریہ کے گھر کے ساتھ رہتی تھی اسی لیے اس کے حالات سے اس حد تک واقف تھی۔

”گھر سے کدھر نکال دیا ہے؟ اسٹیپنڈی ہے کوئی جانو گئی تو نہیں جو گھر سے باہر نکلتے دے۔“ میں نے قدرے بے زاری سے کہا۔

”سر! ہو سکتا ہے سارہ آئی نے اسے ہسپتال بھیج دیا ہو۔“

قاطمہ دوبارہ بولی۔

”ہسپتال؟ کیوں؟“ میں نے چونک کر اسے دیکھا۔

”آپ کو نہیں پتہ سر؟“ بہت سے اسٹوڈنٹس اکٹھے ہوئے تھے۔

”کیا نہیں پتہ؟“ میں یکدم پریشان سا ہو گیا۔

”سر! ماریہ کو تھائی راز گینگنز کا کینسر ہے۔“

”واٹ؟“ میں بے حد شاکڈ سا ہو کر قاطمہ کو دیکھ رہا

تھا۔

ماریہ کتنی تھی اسے کوئی دوست نہیں بتاتا اس کی وہ یہ تھی کہ وہ بیمار تھی۔ زندگی سے لڑ رہی تھی۔ کینسر کوئی چھوٹا کا مرض نہیں تھا مگر یہ ہمارے معاشرے کا المیہ ہے کہ بیمار اور معذور انسانوں کو تنہا کر دیا جاتا ہے۔ وہ چھوٹا سی لڑکی جو مجھے مومو کی یاد دلاتی تھی وہ بھی اسی لیے کاٹھا رہ گئی۔

”کب ہو اسے کینسر؟“ میں فکر مندی سے پوچھنے لگا۔

”کبھی عرصے سے ہے۔ اب تو آخری اسٹیج ہے۔ چند ماہ پہلے ڈاکٹرز نے کہا تھا کہ اس کے پاس چھ ماہ سے ایک برس تک کا وقت ہے۔“ قاطمہ کے لہجے میں ناسف تھا۔

میں سر ہلا کر بے دھیانی سے اسٹوڈنٹس کی اسائنمنٹس دیکھنے لگا۔ دل میں مجھے بار بار ماریہ کا خیال رہا تھا۔

پتہ نہیں وہ کدھر ہوگی کس حال میں ہوگی۔ اگر اس کی سوتیلی ماں نے اسے گھر سے نکال کر ہسپتال بھیج دیا ہو تو وہاں اس ساتھ کوئی ہوگا؟ یا وہ تنہا کمرے میں اپنی زندگی کے آخری دن کاٹ رہی ہوگی۔ پتہ نہیں اس کے پاس اس کے برش کھڑا اور کینوس بھی ہوں گے یا نہیں اور اس کا وہ پنک

فٹر کا بیگ جو وہ ہمیشہ اپنے پاس اٹھائے رکھتی تھی پتہ نہیں وہ بیگ اس کی سوتیلی ماں نے اسے ساتھ لے جانے دیا ہوگا یا نہیں۔

بہت سے سوال تھے جن کے جوابات میرے پاس نہیں تھے۔ میرا دل ارد گرد سے سخت اچاٹ ہو چکا تھا۔ میں نے بچوں کی جلدی چھٹی کر دی اور خود اپنے داخلہ رجسٹر سے ماریہ کے والد کی ID کارڈ کی فوٹو کاپی سے اس کا

ایڈریس لے کر اس کے گھر چلا گیا۔

اس کی بے حد خوب صورت مگر سرد سوتیلی ماں نے انتہائی کھردرے اور روکھے انداز میں مجھے اتنا ہی بتایا۔

”کل صبح آپریشن ہے مومو کا۔ سی ایم ایچ میں ایڈمٹ ہے۔“

میں نے کمرہ نمبر پوچھ کر استفسار کیا ”اس کے پاس کوئی ہے یا وہ اکیلی ہے؟“

”حسن صاحب! ہم یہاں فارغ نہیں بیٹھے کہ مومو کی پابنتی سے لگ کر اس کا دل بھلا میں سوکام ہوتے ہیں۔ فرصت کے ہے یہاں؟ جب تاہم ملے تو چلے جاتے ہیں۔“

”انداز میں لا تعلقی اور بے نیازی تھی۔ وہ واقعی

بہت دلی سوتیلی ماں تھی۔

میں ماریہ سے ملنے اسلام آباد سے پنڈی سی ایم ایچ چلا گیا۔ سارہ نے جان بوجھ کر اسے پنڈی میں داخل کروایا تھا

برہ اس کا باپ اس سے ملنے روز روز نہ جاسکے۔

میں نے تازہ سرخ گلابوں کے ایک بو کے خرید اور ہسپتال آگیا۔ ایسا ہی ایک بو کے میں نے مومو کو بھی دیا تھا

اور حیدر کہتا تھا ”مومو نے دے۔ پھول کتابوں میں سکھا کر رکھے ہوئے تھے۔“

مومو کو ذہن سے جھٹک کر میں ماریہ کے وارڈ کی طرف چلا گیا۔

دروازہ ہلکا سا بجا کر میں اندر داخل ہوا۔ وہ ایک درمیانے سائز کا وارڈ تھا درمیان میں پردوں سے پارٹیشن کیا ہوا تھا ایک طرف ماریہ کا بیڈ تھا دوسری جانب کا بیڈ

مجھے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

”مومو۔“

ماریہ بیڈ پر تکیوں کے سہارے ٹیک لگا کر لیٹی ہوئی تھی۔ وہ چھت کو دیکھ رہی تھی۔ آہٹ پر اس نے نگاہیں اٹھا کر

میری جانب دیکھا۔ ایک دم اس کی بھوری آنکھوں میں حیرت نما خوشی ابھری تھی۔

”سر آپ ادھر؟“ اس نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی

میں نے اسے اشارے سے روکا۔

”یہ جو اس چھوٹی سی گزیا نے بغیر بتائے اتنی ذہیر ساری جھپٹا کی ہیں نا اس کے لیے اب اس کے سڑاٹنے آئے

ہیں۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہہ کر پھولوں کا گلدستہ اس کے ہاتھ میں دیا۔

”تھنک یو سر!“ اس نے انہیں سونگھا۔ وہ بہت خوش اور فریض نظر آنے لگی تھی۔ درندہ جس مل میں داخل ہوا تھا وہ مجھے بہت پشیمان لگی تھی۔ اس کی آنکھوں کے گرد

نلکے بڑے تھے چہرہ سوکھ چکا تھا ڈال اندر کے چہرے تھے اور رنگت پر قان کے مریضوں کی طرح زرد تھی۔

”مجھے ریڈ روز بہت اچھے لگتے ہیں سر! کیونکہ ان کا

مسیح بہت اچھا ہوتا ہے۔ بے ناسر؟“ وہ سر اٹھا کر میری ہنسی دیکھتے ہوئے مسکراتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

میرے ذہن کی روکیں دور بھٹک گئی۔ ایسی ہی بات مومو نے بھی کی تھی۔ میں نے سر جھٹکا۔

”کیسی ہو مومو؟“ میں اس کے ساتھ بیڈ پر بیٹھ گیا۔

”ٹھیک ہوں سر! کل میرا آپریشن ہے۔“ وہ اداس سی

ہو گئی۔

”اداس مت ہو! کرو مومو! تم مجھے بہت عزیز ہو۔“ میں نے اس کا چھوٹا سا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر

آہستہ سے دبایا۔

”سر! سارہ ماما نے مجھے شروع سے بتا رکھا تھا کہ مجھے

کینسر ہے۔ آپ کو پتہ ہے ڈاکٹرز بچوں کو یہ بات نہیں

بتاتے۔“ وہ معصومیت بھرے انداز میں سارہ ماما کی شکایت لگا رہی تھی۔ ”پتہ ہے کیوں؟“

میں نے بھی اسی معصومیت سے نفی میں گردن ہلا دی۔

”کیونکہ جب بچوں کو پتہ چل جاتا ہے نا تو وہ خوف زدہ

ہو کر بہت جلدی مریجاتے ہیں۔“

”ماریہ!“ میں ایک دم تڑپ اٹھا تھا۔ ہسپتال میں رہ کر وہ

پتا نہیں کیا کیا سنتی رہتی تھی۔

”کل تمہارا آپریشن ہے جس کے بعد تم بالکل ٹھیک

ہو جاؤ گی۔ پھر ہم خوب ذہیر ساری باتیں کریں گے۔“ کچھ

دیر بعد اسے تسلی دے کر میں اٹھنے لگا تھا۔

اس نے ہاموسی سے مجھے دیکھا۔ ”آپ جا رہے ہیں سر؟“

”ہاں میں کل آؤں گا ماریہ۔“ مجھے ہسپتال سے

دشست ہو رہی تھی۔ میں جلد از جلد وہاں سے بھاگ جانا

چاہتا تھا۔ جتنا وقت میں ماریہ کے ہمراہ گزارتا تھا مجھے مومو یاد

آتی رہتی۔

”آپ نہ جائیں سر!“

”اوکے نہیں جاتا!“ پتہ نہیں کیوں میں دوبارہ بیٹھ گیا۔

”کل میرا آپریشن ہے۔ کیا میں زندہ رہوں گی سر؟“ وہ

ڈری سہمی ہوئی لگ رہی تھی۔

میں اس کے سر ہانے آکر بیٹھ گیا اور دونوں ہاتھ اس کے

شانوں کے گرد رکھے۔ ”بس بیٹا! ایک چھوٹا سا معمولی سا

آپریشن ہے۔ میرے ایک بھانجے کے ایسے چھ آپریشن

ہوئے تھے اور اب وہ بھلا چنگا ہے۔“ میں نے اسے تسلی

دی۔ حالانکہ میری تو کوئی بہن ہی نہیں تھی۔

اس کی بھوری آنکھوں میں امید کی کرن جاگی۔

”یہ بس چھوٹا سا آپریشن ہے اس کے بعد تمہیں اس

ہسپتال اور ان کڑوی کڑوی دواؤں سے ہمیشہ کے لیے

نجات مل جائے گی۔ تم بالکل ٹھیک ہو کر گھر چلی جاؤ گی۔“

اس کے سر ہانے بیٹھ میں اسے تسلیاں دے رہا تھا۔

”کب ہے آپریشن؟“ پھر میں نے پوچھا۔

”مجھ بھی۔“ اس کا خوف اب کم ہو رہا تھا۔
 ”بس اب تھوڑا سا ٹائم رہ گیا ہے۔“ میں نے رات کے ساڑھے نو بجاتی سوئی کو دیکھا۔
 ”سرا!“ تھوڑی دیر بعد اس نے مجھے پکارا ”میں پینٹ کرنا چاہتی ہوں۔“
 ”تھوڑی دیر میں تھیں کونز اور چین لادیتا ہوں۔“ میں اٹھنے لگا تو اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔
 ”نہیں بس مجھے میرا بیک اٹھا دیں۔“ اس نے اپنے پٹک بیک کی جانب اشارہ کیا جو میز پر اٹھا تھا۔ صد شکر اس کا وہ بیک اس کے پاس تھا۔
 میں نے بیک اٹھا کر اسے دے دیا۔
 اس نے آہستہ سی زپ کھولنی پھر آہستہ آہستہ اندر سے برش وائر بینسنس باہر نکالنے لگی۔ ایک کانڈ کو کلپ بورڈ میں لگا کر اس نے چسل تمام لی۔
 ”مومو! کیا یہ بستر نہیں ہے کہ تم آرام کرو؟ کل تمہارا آپریشن ہے۔“
 میں نے کسی خدشے کے پیش نظر کہا تھا۔
 ”پلیز سرا!“ اس نے اتنی سچی نگاہوں سے میری طرف دیکھا تھا یہ زندگی اور موت کی جنگ لڑتی اس لڑکی کی بے بس آنکھیں تھیں۔ میرا دل بھر آیا۔
 ”اچھا بٹالو مگر کیا بناؤ گی؟“
 اس نے چسل کا سرائیوں میں پکڑ کر ایک لمحے کو سوچا، پھر مسکرائی۔ ”مومو!“
 ”اپنی شکل بناؤ گی؟“
 ”ارٹ نہیں سرا!“ وہ دھیرے سے ہنسی۔ اس کی سوکھی زرد چہرے کی ہڈیاں ہستے ہوئے نمایاں ہو جاتی تھیں۔
 ”میں نہیں آپ کی مومو۔“
 ”میری مومو؟“ مجھے حیرت ہوئی تھی۔
 ”آپ نے اپنی مومو کا جو پورٹریٹ بنایا تھا نا، وہ میرے پاس ہے۔ میں روز اسے دیکھتی ہوں مجھے وہ ہمیں ہو گا۔“
 ”تھیں میں آپ کو بتا کر دکھاتی ہوں۔“
 اور پھر وہ بہ وقت تمام تصویر بنانے لگی۔
 میری مہر النساء پتیلی تھوڑی تلے رکھے فاتحانہ لگا ہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس نے ایسے مجھے تب دیکھا تھا جب ناعمہ نے میرے سامنے بد زبانی کی تھی۔
 ”آپ کی مومو بہت اچھی ہے سرا! آپ اپنی مومو کو منالیں پلیز“ تصویر بناتے بناتے وہ بولی تھی میں جواب میں

کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ کافی دیر بعد ماریہ نے تصویر مکمل کی۔
 ”کیسی ہے سرا؟“ اس نے مجھ سے پوچھا تھا۔
 ”بہت اچھی۔“ میں نے سفید کانڈ کو ہاتھ میں لیے اس پر ہٹا کیچ دیکھا۔ وہ نوے فیصد مومو سے مشابہت رکھتا تھا۔
 ”اب کلرز کرو گی اس میں؟“
 ”نہیں میں تمہک گئی ہوں۔“ اس نے تھکاوٹ سے میرے کندھے پر سر رکھ دیا۔
 میں آہستہ آہستہ اس کا سر تھکنے لگا۔ جب وہ غیند کی آغوش میں جانے لگی تو اس کے لبوں سے نکلا تھا ”میں زندہ رہوں گی یا سرا؟“
 ”میری مومو کو کچھ نہیں ہو گا۔“ میں نے کہہ دیا مگر میرے اندر بہت خوف تھا۔
 ساری رات میں اس کے پاس بند کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھا رہا۔ وہ چھوٹی سی بچی میرے کندھے پر سر رکھ کر سو رہی تھی۔ رات آہستہ آہستہ سرکنے لگی۔
 وہ غیند میں تھی جب ڈاکٹر اسے لینے آ گئے۔ میں اب ایک امیڈنٹ بن گیا تھا۔ انہوں نے اسے غیند میں ہی انسٹیسیا دیا تھا تاکہ میری خواہش تھی کہ وہ اسے جگا دیتے اور میں چند ایک باتیں تو ماریہ سے لے لیتا۔ میں نے مومو کا کیچ جو مومو نے بنایا تھا اپنی جیب میں ڈال لیا۔
 مسلسل تین گھنٹے ماریہ کا آپریشن ہو تا رہا تین گھنٹے میں ہسپتال کے سرد، ویران کوریڈور میں بے چینی سے نہنٹا رہا۔ میرے قریب سے آری یونیفارم میں ملبوس نرسیں اور ڈاکٹر گزرتے رہے، کوئی میری پریشان صورت دیکھ کر تسلی کے دو لفظ بول دیتا تو کوئی ترحم بھری نگاہ ڈال کر چلا جاتا۔
 بالآخر میں تھک کر ماربل سے بنے فرش پر دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھ گیا۔ سردی کا کوئی احساس مجھے نہیں ہو رہا تھا۔ میرا رواں رواں ماریہ کے لیے دعا گو تھا۔
 تین گھنٹے کا وہ طویل انتظار، بمشکل کٹ ہی گیا اور آپریشن ٹیم کا دروازہ کھلا۔ کمرل ڈاکٹر عابد بیک باہر نکلے۔
 ”آپ بچی کے والد ہیں؟“ انہوں نے چہرے پر سے ماسک اور ہاتھوں پر سے گلوزا اتارتے ہوئے مخاطب کیا۔
 ”نہیں، ہم میں اس کا انکل ہوں۔ کیسی ہے وہ؟“ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا۔
 ”دیکھئے“ اس کا تھائی راڈ گینڈو مومو کرنا تھا، تھائی راڈ

گینڈو کے پیچھے ایک nerve ہوتی ہے اور۔۔۔“
 ”مجھے بتائیں ماریہ کیسی ہے؟“ میں نے بے چینی سے ان کی بات کاٹی۔
 انہوں نے گہری سانس بھری۔ ”وہ جو خاص رگ ہوتی ہے نا، وہ ان کی آپریشن کے دوران کٹ گئی ہے۔ آئی ایم سوری ماریہ کی ڈیوٹی ہو گئی ہے۔ دراصل اس رگ کو کٹنے سے بچنا بہت مشکل تھا۔“
 وہ گھبراہٹ سے کہہ رہے تھے؟ میں سن نہیں پا رہا تھا، مجھے سنائی ہی نہیں دے رہا تھا۔ بہت کچھ میرے ذہن میں گڈنڈ ہو رہا تھا۔
 میری کلاس روم میں کھڑکی کے ساتھ رکھی وہ کرسی خالی تھی، وہ کرسی ماریہ کا انتظار کر رہی تھی اور ڈاکٹر کہہ رہا تھا ”ماریہ مر گئی؟ ماریہ کی ڈیوٹی ہو گئی؟ بالکل ایسے ہی ڈاکٹر ناشی کی ہونے لگا تھا، حیدر کی ڈیوٹی ہو گئی، حیدر مر گیا! بس اس ایک لفظ کا نا تھا زندگی اور موت کے درمیان؟ وہ مر گئی؟ وہ مر گیا؟“
 کیوں قدرت اتنی ظالم ہوتی ہے؟ ماریہ کو کیوں مار ڈالا؟ کیا مانگا تھا اس لڑکی نے زندگی سے سوائے اپنے رنگوں، خوشبوؤں اور تیلیوں کے؟ وہ کیوں مر گئی؟
 میرے سامنے اسٹریچر پر اس کی میت سفید چادر سے ڈھکی پڑی تھی، میں نے کرزنی انگلیوں سے چادر کا سرا اٹھا کر اس کا چہرہ دیکھا۔ سفید، ساکت، چہرہ۔
 کتنی امید دلائی تھی میں نے اسے، کتنے جھوٹ بولے تھے میں نے اس سے، کتنی بار کہا تھا ”تم بچ جاؤ گی مومو! تھیں کچھ نہیں ہو گا اور وہ مجھ پر یقین کر کے کتنے سکون سے آپریشن ٹیم میں جا گئی تھی؟ کتنی برس ہوئے، ایک مومو مجھ سے ناراض ہو کر چلی گئی تھی۔ اور آج ایک دوسری مومو مجھ سے دور جا چکی تھی۔ کیوں مجھے سب چھوڑ کر جاتے ہیں؟“
 میں ہمیشہ آخر میں تنہا کیوں رہ جاتا ہوں؟

والوں کو آگاہ کرتے تھے ”یہ مومو کی سیٹ ہے۔ وہ کینسر سے مر گئی تھی۔ یہ اس کی جگہ ہے، یہاں کسی نے نہیں بیٹھنا۔ سر کو دکھ ہو گا۔“ اور نے طلبہ سمجھ کر سر ہلا دیتے۔
 ماریہ کی موت کے تین برس بعد جب میں نے کلاس کا فرنیچر بدلوا لیا تو وہ کرسی وہاں سے نہیں اٹھوائی۔ کھڑکی کے ساتھ وہ کسی سی پڑی رہی۔
 اس دوران میں ایم فل کر کے آرٹ کے شعبے ہی کو بی ایچ ڈی کے لیے منتخب کیا، جب بی ایچ ڈی مکمل ہوا تو میں نے یونیورسٹی میں بطور آرٹ ڈائریکٹر کے جوائن کر لیا۔
 میری اکیڈمی اب بھی جاری تھی، اور کھڑکی کے ساتھ والی کرسی اب بھی خالی تھی، مومو اور مومو کی کرسی میری اکیڈمی میں لیجنڈ کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔

سیادگ میں دو کپ کے برابر کافی پھینٹ کر میں نے آذر دگی سے اسے دیکھا تھا۔ ان تمام پچھلے برسوں میں، میں روز صبح دو کپ کافی پھینٹتا تھا۔ اپنے کپ میں دوڑھ اور چینی ڈال کر پی لیتا۔ جبکہ دوسرے کپ میں پھینٹی ہوئی کافی رتبہ دیتا۔ شاید کہ وہ پلٹ آئے۔ مگر ہرون کے اختتام پر جب مومو کہیں نہ ہوتی تو میں بے حد مایوسی سے اس کی کافی سنگ میں بہا دیتا تھا۔

آج میں نے کافی اس کے کپ میں ڈالنے سے پہلے ہی بہا دی، اب کیوں اور کس کا انتظار کروں۔ گیارہ برس کسی کو بھولنے کے لیے کافی ہوتے ہیں۔ وہ کیوں واپس آئے گی؟ کیا رکھا ہے اس کے لیے یہاں؟

میں نے تہہ کر لیا تھا کہ آئندہ اس کی کافی نہیں بناؤں گا۔ وہ اب نہیں آئے گی۔ وہ کبھی نہیں آئے گی۔

”شاید دودھ والا ہو۔“ میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولتے ہوئے باہر نکل کر دیکھا چاہا، مگر ایک لمحے کو تو زمین نے میرے قدم جکڑ لیے۔

میرے سامنے، میرے گھر کے باہر، میرے دروازے پر مومو کھڑی تھی۔ مومو۔۔۔ میری مومو۔۔۔ میری مہر النساء میں نے پللیں زور سے جھپک کر اسے دیکھا۔ وہ کوئی الوڈن نہیں تھا۔ وہ میری مہر النساء ہی تھی۔

بلکے آسمانی قمیص شلوار پہنے، کندھے پر ہم رنگ دپینہ ڈالے، وہ مومو ہی تھی۔

اس کا چہرہ پہلے سے قدرے میچور لگ رہا تھا۔ بال اب

ویسے لے نہیں تھے، بلکہ کندھوں سے بھی قدرے اوپر تھے۔ اس نے بھورے بالوں میں blonde اسٹریکنگ گرائی ہوئی تھی اور ان کو کیچر میں ایسے باندھ رکھا تھا کہ چند لٹیں چہرے کے اطراف میں بکھری ہوئی تھیں۔ دروازہ کھلنے پر اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔ ”مومو!“ اس لمحے مجھے اتنی خوشی ہوئی تھی کہ مجھے اپنا دل بند ہوتا محسوس ہوا تھا۔ میری مومو میری مرثیہءِ دل واپس آگئی تھی۔

”السلام علیکم سرا“ وہ دھیرے سے مسکرائی۔

”وعلیکم السلام۔“ خوشی کے مارے مجھ سے کچھ بولا ہی نہیں جا رہا تھا۔

”ہو۔۔۔ اندر آؤ۔“ میں نے راستہ چھوڑ دیا۔ وہ آہستہ سے چلتی ہوئی اندر آگئی۔ اس نے اپنے دائیں ہاتھ میں کوئی تہہ شدہ کپڑا اٹھا رکھا تھا، میں نے دھیان نہیں دیا۔

”آؤ بیٹھو۔“ میں نے لونگ روم میں رکھے صوفے کی جانب اشارہ کیا۔ وہ طائرانہ انداز سے اطراف کا جائزہ لیتی ہوئی نہایت نزاکت سے صوفے پر بیٹھ گئی۔ میں جلدی جلدی اس کے لیے کافی پھینٹنے لگا۔ اگر میں چند لمحے پہلے اس کے حصے کی کافی نہ گرا تا تو کم از کم اسے دکھا کر مرعوب و متاثر کری سکتا تھا۔

وہ صوفے پر بیٹھی ارد گرد کا جائزہ لے رہی تھی۔ اب میرا لونگ روم پہلے کی نسبت بے حد صاف ستھرا ہوا تھا۔ دفعتاً اس کی نگاہ سائڈ ٹیبل پر رکھی گولڈ لف کی بیس پر پڑی۔ اس نے چونک کے مجھے دیکھا۔ ”یہ چھوڑی نہیں ابھی تک؟“

کافی پھینٹتے ہوئے میں مسکرایا۔

”بہت کچھ چھوڑ دیا ہے مومو! مگر اس کو نہیں چھوڑا۔“ اس نے سر ہلادیا مگر شاید وہ میرے لہجے پر غور کر رہی تھی۔ اس کے کپ میں دو وہ ڈال کر میں نے دونوں کپس ڈالے۔ میں رکھے۔ ساتھ شوگر پاٹ رکھا اور سینٹر ٹیبل پر لاکر ڈال دیا۔ اس نے خود ہی آگے بڑھ کر شوگر پاٹ اٹھا لیا اور ایک نیچے میرے کپ میں ڈال کر آدھا اپنے میں ڈالا۔

”تمہیں تمہیں یاد تھا مومو؟“ میرے من میں نغمے گونجنے لگے تھے۔

”میں کچھ بھولی ہی کب ہوں؟“ اپنے کپ میں چمچ

ہلاتے ہوئے وہ چٹکوں کی باڑ جھکا کر بولی۔

میں نے کافی کا گھونٹ بھرا۔ وہ بنائی میں نے تھی مگر اس میں چینی مومو نے کس کی تھی۔ ایک دم سے بہت ذائقہ آ گیا تھا اس میں۔

”کیسے ہیں آپ سر؟“ چند گھونٹ بھر کر اس نے ساوگی سے پوچھا۔

”ویسا ہی جیسا تم چھوڑ کر گئی تھیں۔“

اس نے گہری سانس بھری اور پھر ادھر ادھر دیکھا۔

”آپ کی وائف کہاں ہیں؟ سو رہی ہیں؟ میں جلدی آ گئی ہا؟“

میں نے غور سے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ”میں نے شادی نہیں کی مومو!“

کافی کا کپ لبوں کی طرف لے جاتے ہوئے اس کے ہاتھ یکدم ساکت سے ہو گئے۔ وہ چٹکیں جھپکائے بغیر بعد شاکندسی ہو کر مجھے دیکھ رہی تھی ”جی؟“

”میں نے شادی نہیں کی“ میں نے سر جھٹک کر ہرایا۔

کتنی ہی دیر وہ ساکت بتلیاں لیے مجھے دیکھتی رہی۔

”دفعتاً اس کے لبوں میں جنبش ہوئی۔ ”کیوں سر؟“

میں نے شانے اچکا دیے۔ ”کوئی ملی نہیں۔“

اس نے سر جھٹکا۔ میں نے بات کا رخ بدل کر پوچھا۔

”کب سے آئی ہوئی ہو ادھر؟“

”سات۔۔۔ یا آٹھ“ نہیں شاید سات۔۔۔ وہ ذہن میں حساب کر رہی تھی۔

”اچھا۔ یعنی ہفتہ ہو گیا ہے۔“

اس نے گہری سانس اندر کو کھینچ کر مجھے دیکھا، پھر نفی میں گردن ہلائی۔

”آٹھ دن نہیں آٹھ ماہ ہو گئے ہیں۔“

میں نے بے یقینی کے عالم میں کپ میز پر واپسی رکھا۔

”تم آٹھ ماہ سے ادھر ہی ہو؟“

”ادھر نہیں، لاہور میں تھی پڑھ رہی تھی۔ ایف ایس سی بھی پیس سے کی۔“

”اور اور کینیڈا میں پڑھائی نہیں کی؟“

اس کا چہرہ ہل بھر کو تاریک سا ہوا تھا۔ ”نہیں سردا دو کی ڈینہ کے بعد کینیڈا سے واپس لاہور آگئی تھی کینیڈا سے تو دو سال بعد ہی واپس آگئی تھی۔ وہاں پڑھائی نہیں کی تھی۔“

مجھے یاد آگیا تھا۔ ”مومو مجھے حیدر کا بہت۔۔۔“ میں ہل بھر کر رکنا کیسے تعزیت کروں؟ وہ تو میرا دوست تھا۔۔۔ میں۔۔۔ میں کچھ کہہ نہیں پا رہا تھا۔ اس نے سر جھکا لیا۔

”اسے کیا ہوا تھا مومو؟“

”انجائنا کا اٹیک تھا۔ ہم اسپتال لے کر گئے مگر ایسولینس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ پیپا کی ڈینہ ہو گئی مجھے چو میں آئی تھیں۔“ وہ سر جھکا کے بتا رہی تھی۔

”اور تم لوگ کینیڈا چلے گئے؟ میرا انتظار بھی نہیں کیا میں نے شکوہ کیا تھا۔“

اس نے سر اٹھا کر حیران نظروں سے مجھے دیکھا۔

”انتظار؟ پیپا نے انتظار ہی تو کیا تھا آپ کا روز صبح شام چکر لگاتے تھے وہ آپ کے گھر کے۔ مگر آپ نہیں آئے۔ دو ماہ تک وہ آپ کے گھر کے چکر لگاتے رہے۔ دو ماہ میں ساتھ دن ہوتے ہیں سر اور پھر داد نے بھی آپ کا انتظار کیا تھا۔ لیکن جب وہ آپ کی جانب سے بالکل مایوس ہو گئیں تو ہم سین خالہ کے ساتھ چلے گئے وہ قدرے توقف سے ٹھنڈی ہوئی کافی پر نگاہیں جما کر بولی۔

”آپ کب آئے تھے سر؟“

”تمہارے جانے کے اگلے روز۔“

”کیا کیا آپ نے ان ساڑھے دس گیارہ سالوں میں؟“

اس کے انداز میں برسوں کی مسافت کی تھکاوٹ تھی۔

”میں نے آرٹ اکیڈمی کھول لی، پھر لی ایچ ڈی کی اور اب اکیڈمی کے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھاتا بھی ہوں۔“

”آرٹ اکیڈمی؟“ اس نے حیرت سے لگ میز پر رکھا۔

”تمہیں رنگوں سے کھیلتا اچھا لگتا تھا نا، میں نے تمہارے لیے اکیڈمی کھول لی مومو!“ میں کرب سے مسکرایا۔

”تمہارے ہاتھ کتے تھے کہ تم پینٹر بنو گی۔“

”میرے ہاتھ تو یہ بھی کتے تھے کہ میں سرجن بنوں گی۔“

”تو۔۔۔؟“

اس نے گود میں رکھا سفید سا کپڑا میرے سامنے کیا۔ وہ ایک اور آئل تھا۔

”مومو!“ میرے لبوں سے صرف اتنا ہی نکلا تھا۔

”میں پینٹر نہیں بن سکی سر! میں سرجن ڈاکٹر بن گئی ہوں۔ ایک برس پہلے تعلیم سے فارغ ہوئی ہوں پہلے کچھ عرصہ گجرات میں جاب کی، پھر ادھر آگئی۔“

”تم۔۔۔ میں کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ اس نے ان رنگوں کو

بھلا دیا تھا جن سے میں نے پچھلے اتنے برس بے تحاشا محبت کی تھی۔

”میں پچھلے کئی برس اپنی فطرت کے خلاف بھاگتی رہی ہوں سر اور اب۔۔۔“ وہ دھیمی دھیمی سے مسکرائی۔

”اب تھک گئی تھی اسی لیے واپس آگئی۔“

”تمہارے ہنر مند اور فیملی؟“ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا تھا۔ وہ کتنی ہی دیر میری جانب دیکھتی رہی پھر نفی میں سر ہلادیا۔ ”میں نے شادی نہیں کی۔“ وہ سر جھکا لے بولی۔ اس کی آواز میں عجیب سی لرزش تھی۔

”کیوں؟“ مجھے طمانیت بھی ہوئی تھی اور حیرت بھی اس نے چٹکیں اٹھا کر شاکی نظروں سے مجھے دیکھا۔

”کوئی ملا نہیں۔“ پھر اپنا اور آل اٹھا کر وہ کھڑی ہو گئی۔

”چلتی ہوں سر! آپ کی اکیڈمی آؤں گی۔“

میں نے کھڑے ہوتے ہوئے قدرے دکھ سے اس کے اور آں کو دیکھا۔ ”تمہیں تو پینٹر بننا تھا مومو!“

”زندگی میں سب کچھ غیر متوقع ہی ہوتا ہے سر!“

وہ مغموم انداز میں کہہ کر دروازے کی جانب بڑھ گئی۔ ”مومو!“

آدھا دروازہ کھول کر اس نے پلٹ کر مجھے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ میں نے سر جھٹکا۔ ”کچھ نہیں۔“

”کہہ ڈالیں سر! آپ ہمیشہ باتیں ان کی چھوڑ دیتے ہیں۔“ وہ بہت پرسکون انداز میں بولی تھی۔

”تم یقین نہیں کرو گی۔“

وہ محل کر مسکرائی۔ ”کیا یہی کہنا چاہتے ہیں کہ آپ میرے گھر روز شام کو چھ بجے آیا کرتے تھے؟“ میں مبہوت سا ہو کر اسے دیکھے گیا۔ ”تمہیں کیسے پتہ مومو؟“

”بعض عادتیں فطرت بن جاتی ہیں سر! جب میں سین خالہ کے غیر مانوس گھر کی غیر مانوس لاہوری میں شام چھ بجے آپ کے انتظار میں کتابیں کھول لیا کرتی تھی تو آپ تو پھر بھی ان ہی مانوس رستوں پر سفر کرتے تھے۔ کب تک آتے رہے تھے میرے گھر؟“

”دو سال تک!“

اس نے مسکرا کر مجھے دیکھا۔ پھر خدا حافظ کہہ کر باہر نکل گئی۔ میں وہیں ساکت سا کھڑا دروازے کو دیکھتا رہا۔

☆ ☆ ☆

اس شام میں اپنی کلاس کو پڑھا رہا تھا جب ایک دم

نہنک کر رک گیا۔ میری نگاہیں دروازے پر جمی تھیں۔ تمام اسٹوڈنٹس نے میری نظروں کے تعاقب میں دروازے کو دیکھا۔ وہاں ایک دلنشین مسکراہٹ لبوں پر سجائے مومو کھڑی تھی۔

”میں آ جاؤں سر؟“ اس نے شرارت چھپاتے ہوئے معصومیت سے پوچھا۔ میں نے مسکراتے ہوئے سر کو اثبات میں جنبش دی۔

”اسٹوڈنٹس“ یہ آپ کی نئی کلاس فیلو ہیں، ڈاکٹر مہر اساء حیدر! میں نے اس نازک سی لڑکی کا تعارف کرایا اور ڈاکٹر صاحبہ یہ میرے بہت اچھے اسٹوڈنٹس ہیں، امید ہے کہ آپ ان کو تنگ نہیں کریں گی۔“ میرے لمبے کی شرارت پر وہ کھنکھلا کر ہنس دی۔

”بالکل نہیں کول گی“ میں بیٹھ جاؤں سر؟“ اس نے بچوں کی طرح اجازت مانگی۔ میں نے مسکراہٹ چھپا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ کرسیوں کی جانب بڑھ گئی۔ تمام کلاس بھری ہوئی تھی۔ کرسی صرف ایک ہی خالی تھی۔ کھڑکی کے ساتھ رکھی لکڑی کی وہ کرسی جو دوسرے فرنیچر سے بیچ نہیں کٹی تھی۔ مومو اس کرسی کی جانب بڑھ گئی۔ جس کے دو وہاں بیٹھنے لگی، ساتھ والی نشست پر بیٹھی اٹھارہ سالہ اسماء نے پریشان ہو کر اسے روکا۔

”آپ ادھر نہ بیٹھیں۔“ مومو بیٹھتے بیٹھتے رک گئی۔ ”مگر یہاں اور کوئی کرسی خالی ہی نہیں ہے۔ یہ کیا کسی کی جگہ ہے؟“ اسماء نے میری جانب دیکھا اور پھر آہستہ سے مومو کو مخاطب کیا: ”یہ سیٹ مومو کی ہے، سر اس پر کسی کو نہیں بیٹھنے دیتے۔“ اسماء کی مدھم سرگوشی مجھے سنائی دے رہی تھی۔

”مومو؟“ مومو نے بے حد چونک کر اسماء کو دیکھا۔ ”سر کی کوئی چھوٹی سی بچی فریڈ تھی، اس کا تک نیم مومو تھا۔ ایک دم مومو کھل کر مسکرائی اور اپنا پرس اسی کرسی کے بازو سے لٹکا کر اس پر بیٹھ گئی۔

”تمہیں پتا ہے یہ میری سیٹ ہے؟“ اس نے اسماء کو کہہ کر میری جانب دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں خوشی، بے یقینی اور تشکر تھا۔ چند اسٹوڈنٹس نے پریشان سا ہو کر مومو کو دیکھا۔

”اُس اُس کے۔۔۔ یہ مومو کی سیٹ ہے۔ بیٹھی رہو“ مومو! میں نے مسکرا کر کہا۔

مومو بہت خوشی ہوئی تھی، وہ جو سمجھ رہی تھی، کیا وہ مجھے جاننے کی ضرورت ہے؟

کلاس ختم ہونے کے بعد مومو میرے پاس آئی تمام اسٹوڈنٹس باہر جا رہے تھے، میں اپنی چیزیں سمیٹ رہا تھا۔ ”سر! آپ مجھے ڈراپ کروں گے؟“ اس نے اپنا پرس کندھے پر ڈالتے ہوئے استفسار کیا۔

”ہاں شیورا!“ میں نے اپنا سامان سمیٹ کر چھوٹے سے بیگ میں ڈالا، پھر ایک خیال کے تحت پوچھا ”آئی“ کیسی ہو؟“

”نیکسی ہے!“ ”مومو!“ میں نے براہی سے اسے دیکھا۔ ”اگر تمہارے پاس گاڑی نہیں تھی تو مجھے کہہ دیتیں، میں تمہیں پک کر لیتا۔ نیکسی میں دھکے کھانے کی کیا ضرورت تھی؟ اب خبردار جو آئندہ تم نے پبلک ٹرانسپورٹ یوز کی تو“

وہ مسکراتے ہوئے میرے ساتھ باہر آگئی۔ ”تو آپ کو میری پروا ہے سر؟“

میں نے ایک لمحے کو رک کر اسے خفگی سے دیکھا۔ ”کیا تمہیں واقعی یقین نہانی کی ضرورت ہے؟“ ”نہیں سر!“ وہ فوراً ”بولی۔“ ”you care I Know“ میں نے ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھول کر فرنٹ سیٹ کالا ک کھولتے ہوئے سنجیدہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”تم میری زندگی میں سب سے اہم شخص ہو مومو! بلکہ میری زندگی میں صرف تم ہی تو ہو“ وہ مسکراتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ گئی۔



روز یونیورسٹی جاتے ہوئے میں مومو کو اسپتال چھوڑ دیتا اور واپسی پر پک بھی کر لیتا۔ اس کا شیڈول روز بدلتا رہتا تھا، مگر میں ہمیشہ اُس کے لیے حاضر رہتا تھا۔

اس روز جب اس کی ازتالیں گھٹنے کی ڈیوٹی کے اختتام پر میں لے گیا تو وہ بہت تھکی تھکی لگ رہی تھی۔ ”اتنی لمبی ڈیوٹی؟“ میں نے فرنٹ سیٹ پر تھکی باری بیٹھی مومو پر ایک نگاہ ڈالی۔

”میری تو کل ہی ختم ہو گئی تھی۔ مگر ڈاکٹر افشاں کو کہیں جانا تھا اس لیے میں اس کی جگہ ڈیوٹی کر رہی تھی۔“

”ایک تو تمہاری سروس بھی نا!“ مجھے اس پر بے حد غصہ آیا تھا ”خواجواہ دوسروں کے پیچھے خود کو ہلکان نہ کیا کرو۔“

”تو کیا ہوتا ہے سر؟ ہم دوسروں کے کام آجائیں اس سے بہتر کیا بات ہو سکتی ہے؟“ وہ سہولت سے بولی۔

”افسانوی باتیں مت کرو مومو! خبردار جو آئندہ تم نے کسی اور کی جگہ ڈیوٹی کی۔“ میں نے گاڑی آہستہ کر لی۔ بینک قریب ہی تھا، مجھے بینک سے ایک ڈرافٹ نکلوانا تھا۔

”تم گاڑی پارک کرو ذرا“ میں اپنا کام کر لوں بینک بند ہی نہ ہو جائے گا۔ گاڑی کی چابی اسے تھما کر میں تیزی سے نکلا اور تقریباً ”بھاگتا ہوا“ بینک میں داخل ہوا۔

پانچ منٹ بعد ہی جب میں اپنا کام ختم کر کے باہر آیا تو پارکنگ ایریا میں عجب سہاں تھا۔

”میرا دس ہزار کا نقصان کر دیا ہے آپ نے۔ اب مجھے بتائیں میرا نقصان کون پورا کرے گا؟ آپ کو گاڑی نہیں ڈرائیو کرنی آتی تو کتنی گولہاں ہیں؟ بہتر ہے کہ آپ کسی ڈرائیونگ انسٹی ٹیوٹ میں جا کر چند دن کچھ سیکھ ہی لیں۔“

میری سفید کرولا کے سامنے کھڑی مومو، چپ چاپ نچلائی بیٹھتے ہوئے ایک درمیانی عمر کے آدمی کی ڈانٹ سن رہی تھی، میں نے ناگواری سے اس آدمی کو دیکھا۔

”کیا مسئلہ ہے؟“ میں نے قدرے سخت لہجے میں اس آدمی کو مخاطب کیا۔ اس غصیلے آدمی نے مڑ کر مجھے دیکھا۔ ”ان محترمہ نے اپنی گاڑی ریورس کرتے ہوئے میری گاڑی کی بیک لائٹس توڑ دی ہیں۔ خدا کی پناہ میں۔“

”محترم“ ایک منٹ، مجھے ان سے پوچھ لینے دیں۔“ میں نے مومو کو دیکھا۔ ”ہاں بتاؤ کیا ہوا ہے؟“

”سر! ان کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ وہ میری گاڑی نہیں تھی، وہ والی کرولا تھی۔“ اس نے اپنے دائیں جانب ہو کر میری کرولا کی مائل ساخت اور رنگ والی گاڑی کی جانب اشارہ کیا، جس میں سے ایک فیملی نکل رہی تھی۔

درمیانی عمر کے آدمی نے قدرے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”پھر اس دوسری سفید کرولا کی جانب بڑھ گیا۔

”سوری سر! معاف کیجئے گا، مجھے سے غلطی ہوئی تھی۔“ چند لمحوں بعد وہ غصیلے آدمی جھاگ کی طرح بیٹھ کر ہم سے معذرت کر رہا تھا۔

”نہیک ہے۔“ سرزمی سے کہہ کر میں نے مومو کو

گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ تمام راستہ میں لب بٹھنے ڈرائیونگ کرتا رہا۔ مجھے اس وقت مومو پر اتنا غصہ چڑھ رہا تھا کہ بہتر تھا میں خاموش ہی رہتا۔

اس کے گھر کے سیاہ آہنی گیٹ کے باہر گاڑی روک کر میں نے اس کی جانب دیکھے بغیر کہا ”خدا حافظ!“

اس نے قدرے شرمندگی سے مجھے دیکھا۔ اس کا بایاں ہاتھ لاک پر تھا، مگر اس نے لاک نہیں کھولا۔ ”سر!“

”خدا حافظ!“ میں بدستور اسٹیمرنگ ہیل کو دیکھ رہا تھا۔ ”ناراض ہیں سر؟“ اس کی آواز گھنی گھنی سی تھی۔

”ناراض؟“ میں نے ایک جھٹکے سے اس کی جانب چھو کیا۔ ”مجھے تم پر غصہ آ رہا ہے۔ مومو! ایک شخص بھرے بازار میں تمہاری انسلٹ کر رہا ہے اور تم گونگی بن کر سنتی رہتی ہو زبردست!“

”میں اس کے خاموش ہونے کا انتظار کر رہی تھی!“ ”خود سے کوئی خاموش نہیں ہوا کرتا مومو! غلط کہنے والے کو خاموش کرانا پڑتا ہے۔“

”یہ وہ بول رہا تھا، میں بچ میں کیسے بولتی؟“ ”تم اب بڑی ہو گئی ہو ڈاکٹر مہر النساء! پریکٹیکل لائف میں اگر تم بچی ہونے کے باوجود دوسروں کی لعن طعن سنتی رہو گی تو اس سے تمہارے خلیل جبران کے اقوال سچ ثابت نہیں ہو جائیں گے، بلکہ لوگ تمہیں شرمندہ سمجھ کر اور اونچا بولیں گے۔ خود کو ڈیفینڈ کرنا سیکھو، مومو!“

”رائٹ سر!“ وہ تابعداری سے سر ہلا کر گاڑی سے اتر گئی، مگر مجھے علم تھا کہ میں جتنا سر بیٹ لوں، وہ کبھی بھی اپنی اس سب سے بڑی کمزوری پر قبو نہیں پاسکتی۔



”ارے!“ مجھ مومو کو جاگنگ ٹریک پر دیکھ کر میں جو بیچ پر بیٹھا سانس ہموار کر رہا تھا، خوشگوار حیرت سے بول اٹھا۔ ”ڈاکٹر مہر النساء اور جاگنگ؟“

”ڈاکٹر حسان اور ریسٹ؟“ اس نے میرے یوں بیچ پر بیٹھنے پر تانک کر حملہ کیا تو میں بے اختیار ہنس دیا۔

”اب ڈاکٹر حسان بوڑھے ہو گئے ہیں مومو بی بی! اب ریسٹ کرنا پڑتا ہے۔“

وہ میرے ساتھ بیچ پر بیٹھ گئی۔ اس بیچ کے پیچھے لگے درخت کی ٹہنیاں قدرے جھک کر ہمارے سروں پر سایہ کر

رہی تھیں۔ باد صبا کے خوشگوار جھونکوں سے ٹہنیوں پر لگے پتے پھڑپھڑاتے جاتے تھے۔ مومو نے ہاتھ بڑھا کر ایک پتا توڑ لیا، پھر اسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے زمین پر گرانے لگی میں نے ایک نظر اس کے سپید ہاتھوں اور ان کے درمیان پکڑے پتے پر ڈالی۔

”آپ کو یاد ہے سراسر! ہم روز ادھر بیٹھا کرتے تھے۔“ وہ بے پروا دیکھتے ہوئے دور کہیں کھوسی گئی تھی۔

”مجھے کچھ بھی نہیں بھولا مومو!“ میں نے قدرے تھک کر نیک لگائی۔

”آپ نے شادی کیوں نہیں کی؟“ اس کے لیے میں الجھن تھی وہ سر جھکائے قدرے آگے ہو کر بیٹھی، پتے کے ٹکڑے کر رہی تھی۔ اس کے کندھوں پر اس کے ٹھورے streaking شدہ بال لہرا رہے تھے۔

”میں نے تمہیں بتایا تھا، کوئی ملی نہیں۔“ میرے لیے میں آزدگی سٹ آئی۔

اس نے پتے کا آخری ٹکڑا بھی زمین پر پھینک دیا، میں نے اس کے سپید ہاتھوں کو دیکھا اور ایک دم میری نگاہیں ایک چہرہ پر ٹھہر گئیں میں یک ٹک اس کی کلائی کو دیکھے گیا، وقت جیسے رک سا گیا تھا۔

اس کی سرسبز کلائی میں وہ پنک گھڑی آج بھی موجود تھی۔ اس کا رنگ پھیکا ہو چکا تھا، اس کے ڈاکل نے وقت بتانا چھوڑ رکھا تھا، مگر مومو نے اب بھی اسے خود سے جدا نہ کیا تھا۔ اسی پنک رنگ کی گھڑی نے بالآخر مجھ سے وہ ٹکڑا دیا، جو میں خود سے کہنے سے بھی ڈرتا تھا۔ جو میں حیدر سے کہنے سے بھی ڈرتا تھا۔

”مجھے شادی کرو گی مومو؟“ اس خوب صورت پارک کے سنگی بچہ پر بیٹھے نگاہیں اس پنک رسٹ واچ پر جمائے، مجھے دنیا والوں کا خوف محسوس نہیں ہوا تھا۔ مجھے اپنی اڑتالیس برس کی عمر کے باوجود ایک چھبیس ستائیس سالہ لڑکی کو پروپوز کرتے ہوئے کسی کا ڈر نہیں تھا۔

مومو نے سر اٹھا کر میری جانب دیکھا۔ اس کی بھوری آنکھوں میں آنسو تھے۔

”کیا آپ کو واقعی مجھ سے پوچھنے کی ضرورت ہے سر؟“ اس کا لہجہ شاک تھا۔

اور بالآخر میں نے مرا تہاء کو پایا لیا تھا۔

میری اور مومو کی شادی 26 نومبر 1997ء کو بہت سادگی سے ہوئی تھی۔

تمام گید رنگ مومو کے گھر پر تھی۔ میری جانب سے میرے چند دوست تھے، رشتے داروں سے تو میں کب سے کٹا ہوا تھا اور انہی کی وفات کے بعد مومو بھی کٹ گئی تھی، سو اس کی طرف سے بھی چند کو لیگ ڈاکٹر زہی تھے۔

البتہ بین کینڈا سے اسٹیشن آئی تھی۔ مومو کو تیار بھی اس نے ہی کیا تھا۔

جب میں نے حیدر کے گھر کے ڈرائنگ روم میں بین کو جی سنوری مومو کا ہاتھ تھام کر اندر لاتے دیکھا تو ایک پل کو تو میں مبسوت سا ہو کر رہ گیا۔

لائٹ پنک اور سلور رنگ کی کاہدار شلوار قمیص میں ملبوس نازک چو لری پہنے، اس نازک سی لڑکی کے حسن کو ذرا سے میک اپ نے دو آنشہ کر ڈالا تھا۔ باوجود اونچے جوڑے کے، اس کے ماتھے پر گولڈن براؤن اسٹریک شدہ، کٹے ہوئے بال نکل ہی آئے تھے۔ پہلی دفعہ میں نے مومو کو قدرے سٹھی سٹھی اور نگاہیں جھکائے دیکھا تھا۔

پلیو ساڑھی میں ملبوس بین نے مومو کو سہارا دے کر صوفے پر بٹھا دیا۔ یہ وہی صوفہ تھا جہاں پہلے مومو کے پکے مومو بہت روئی تھی۔

”بیٹہ جاؤ، حسان!“ سالیوں کے سے شرارتی انداز میں بین نے مجھ سے کہا، وہ میری سالی تھی، کم از کم وہ خود بھی کہہ رہی تھی، حالانکہ وہ مومو کی خالہ تھی۔

میں مومو کے پہلو میں بیٹھ گیا، اس کے دونوں ہاتھ گود میں دھرے تھے۔ ان میں سے ہندی کی تازہ مازہ، جھیننی جھیننی سی خوشبو اٹھ رہی تھی۔

جو آچھپائی، دودھ پلائی، ڈھولک، ایسا کچھ نہ ہوا۔ اس عمر میں مجھے وہ سب بہت بچکانہ لگ رہا تھا۔ بس چند ایک تصاویر اتاری گئیں، جو بین نے ہی اتاری تھیں۔

رکھتی کے وقت مومو بین کے گلے لگ کر خوب روئی تھی، حالانکہ مجھے مومو سے یہ امید نہیں تھی مگر وہ بہر حال روئی تھی۔

”خالا! مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے، مگر۔“ وہ بین کے گلے لگ کر آنسو بہاتے ہوئے کچھ کہہ رہی تھی۔

”غیروں جیسی باتیں کیوں کرتی ہو۔ مومو! تم تو میری بیٹی ہو۔“ مائیں تو بیٹیوں کے لیے بہت کچھ کرتی ہیں۔“

بین نے ساڑھی کے پلو سے آنکھیں خشک کیں۔ ”اچھا، اب اپنے کزنز سے تاملو۔“

مومو مائی حلیمہ اور پھر اپنے تینوں کزنز سے خوب پیار سے ملی اور اپنے آنسو صاف کیے۔

میں نے ہولے سے مومو کا بازو تھاما۔ ”اب مومو میرے حوالے کرو بین! تم فکر مت کرو۔“

بین بیٹگی آنکھوں سے مسکرا دی۔

یوں میری زندگی کے اس بہترین دن، خوشبوؤں میں ہی مومو میرے ساتھ رخصت ہو کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے میرے گھر آگئی۔

☆ ☆ ☆

”لیس یہ کاٹیں میں ذرا گوشت دھولوں۔“ پاز کی پلیٹ چھری سمیت اس نے میرے سامنے میز پر رکھی اور خود کچن میں چلی گئی۔

میں نے اخبار پر سے نظر ہٹا کر ایک لمبے کو پازوں کی پلیٹ کو دیکھا، پھر گردن پھیر کر پیچھے بٹے کچن میں تنگ کے آگے گوشت کو دھوتی مومو کو۔

”تمہارا مطلب ہے کہ میں، یعنی میں ڈاکٹر حسان رضا بی ایچ ڈی پاز کاٹوں؟“ مجھے اس کی بات پر یقین نہیں آیا تھا۔

”جی ہاں میرا یہی مطلب ہے۔“ اس نے بڑے سکون سے جواب دیا۔

وہ گھر کے کپڑوں میں ملبوس تھی۔ بالوں کی پونی بنا رکھی تھی۔ مگر ماتھے والے بال پھر بھی چہرے پر آ رہے تھے۔ دوپٹہ گلے میں تھا اور آستین کھینچوں تک فولڈ کیے ہوئے تھے۔

”آریو سیرس؟“ میں مصنوعی حیرانی سے چیخا تھا۔

”جی ڈاکٹر صاحب! مجھے بریانی بنانی ہے، اس کا مسالا تیار کرنا ہے، اور پاز آپ کاٹیں گے۔“ رات تیزی سے گوشت کو دھو کر ٹوکری میں ڈالتے ہوئے نگاہیں اپنے کام کی جانب مرکوز کیے کہہ رہی تھی۔

”واو! مجھے کیا پتا تھا کہ تم مجھ سے شادی کے دوسرے ہی ہفتے کام بھی کرانا شروع کر دو گی؟ وہ بھی پاز زاف!“ میں نے بڑبڑاتے ہوئے پاز اٹھا لیے۔

”اتنی ساری پاز سے تم ہم دو لوگوں کے لیے کھانا بناؤ گی؟“ میں نے چھری سنبھال لی مگر اپنی پیاری بیوی کو طعنے دینا

نہ بھولا۔

”نہیں صرف ہمارے لیے نہیں۔ ساتھ میں مسز فاروق کے گھر بھی بھجوانے ہیں۔ اصل میں ان کا فون آیا تھا، ان کی نوکرائی سیں ہے۔“

”تو انہوں نے تم سے یہ کہا کہ تم ان کو بریانی بنا کر بھیج دو؟“ لاجول دلا قوت۔“

میں نے سر جھٹکا۔

”ارے نہیں۔۔۔ وہ کیوں کہتیں۔ انہوں نے تو یونہی ذکر کیا تھا۔ میں نے کہا، کھانے کی فکر ہی نہ کریں، میں بنا کر بھیج دوں گی۔ بے چاری اتنا شکریہ ادا کر رہی تھیں، مجھے تو شرمندگی ہونے لگی تھی۔“

”استغفر اللہ مومو! وہ اپنا کام اٹھوانے والی بے چاری ہیں اور شرمندہ تم ہو رہی تھیں۔“ میں نے پازوں کا چھلکا امارتے ہوئے ٹوکا تھا۔

”اف او۔ ایسے تو نہ کہیں حسان!“ نماز کاٹتے ہوئے اس نے قدرے برا مان کر مجھے دیکھا۔ وہ اب مجھے حسان کہتی تھی۔

”اچھا ٹھیک ہے۔ تو اب یہ باقی بریانی تم مسز فاروق کو بھیج دو گی؟“

پاز کاٹتے ہوئے میری آنکھوں میں آنسو آ رہے تھے۔ آواز جھبی بھگی سی گئی تھی۔

”سادی نہیں۔ مسز ظاہر کو بھی تو بھیجوانی ہے۔“ میں نے تنک کر اسے دیکھا۔ ”یہ کون ہیں؟“

”وہی ظاہر صاحب کی بیٹیم۔ نئی نئی شادی ہوئی ہے جن کی وہ جو ابھی پرسوں ہی یہاں شفٹ ہوئی ہیں۔“ مجھے یاد دلاتے ہوئے اس کی نگاہیں مجھ پر تھیں، مگر ہاتھ اسی رفتار سے چل رہے تھے۔

”ہاں یاد ہے۔ تو ان پر کیوں کرم نوازیں کر رہی ہو؟“

”حسان! ان کی نئی نئی شادی ہوئی ہے اور وہ ابھی تو شفٹ ہوئی ہیں۔ ان کو کھانے کی پر اہم ہوتی ہو گی نا!“ سادہ سے انداز میں کہہ کر اس نے کٹے ہوئے نماز ایک طرف رکھے اور ادھر ک اٹھالی۔

”بس! مل گئی پوری کا کوئی کو مفت کی خادمہ، جو کام کر کے خود ہی شرمندہ بھی ہو گی اور وہ احسان کر کے تمہارے ہاتھ کا بنا کھانا لے کر مزے اڑائیں گی۔ سبحان اللہ۔“ میں نے ستائشی انداز میں سر جھٹکا۔

”تم بھی نئی شفٹ ہوئی ہو اور تمہاری بھی ابھی شادی

وئی ہے۔ مگر بہت سادہ ہو تم۔" میں مسمی سانس بھر کر بازوں کی جانب متوجہ ہو گیا۔

"اوہو حسان!" اس نے اور ک کاؤنٹر پر رکھی اور دوپٹے سے ہاتھ پونچھتی میرے پاس آگئی۔ میں صوفے پر بیٹھا تھا۔

میرے سامنے میز پر بیٹھ گئی۔

"اگر ہم کسی کا خیال کریں گے تو کل کو وہ بھی ہمارا خیال کریں گے اور آپ کو کہاں سے غلط فہمی ہو گئی کہ میں حال ہی میں شفٹ ہوئی ہوں؟" اس نے ہنس کر میری جانب دیکھا۔

"میں تو ایک برس کی عمر سے اس گھر میں آ جا رہی ہوں۔ میرے لیے تو کچھ بھی نیا نہیں۔"

میں نے سر اٹھا کر اسے شاکی نظروں سے دیکھا۔

"کیا یہ رشتہ بھی نہیں؟"

"ارے۔" وہ ہنس پڑی۔ پھر میرے ساتھ صوفے پر بیٹھ گئی اور سر میرے کندھے پر رکھ دیا۔ "رشتہ تو نیا ہے۔ مگر ہم تو پرانے ہیں نا؟"

"اور میں تو بہت ہی پرانا ہوں۔" بڑھتی عمر کے احساس کستری نے مجھے اپنی لپٹ میں لے لیا تھا، میری آواز میں خود بخود طنز اور آیت تھا۔

"اب تو میں بھی پرانی ہوتی جا رہی ہوں۔" وہ مصنوعی اداسی سے بولی۔ "ستائیس سال کی ہو گئی ہوں۔ بڑی مشکل سے شادی ہوئی، ورنہ اتنی اور آج لڑکی کو کون قبول کرتا؟" اس نے ایک لمحے کو گدلوں پر سے یوں فرضی آنسو پونچھے کہ میں سمجھا وہ رو رہی ہے، مگر اگلے ہی پل وہ ہنس پڑی۔

کتنے کو تو میں بھی ہنس دیا مگر دور کہیں میرے دل میں عجیب سا خیال آیا تھا۔

"پتا ہے حسان!" اس نے لاڈ سے سر میرے کندھے پر رکھ دیا۔ "میں جب کینڈا میں تھی تو اکثر سوچا کرتی تھی کہ میں نہیں آپ کا انتخاب کون سی لڑکی ہوگی؟ اور دل ہی دل میں مجھے اس لڑکی سے جلیبی محسوس ہوتی تھی اور جب اس روز یارک میں آپ نے کہا، 'مومو تم مجھ سے شادی کرو گی' تو مجھے لگا میں جیسے کوئی خواب دیکھ رہی ہوں۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ میں آپ کی زندگی میں اتنی اہمیت رکھتی ہوں۔"

وہ آنکھیں موندے بہت جذب کے عالم میں کہہ رہی تھی، یکدم چونک کر سیدھی ہو گئی۔

"اوہ! آئل گرم ہو گیا ہو گا۔" وہ کچن کی طرف بھاگی۔

میں نے ایک نظر مومو پر ڈالی، وہ اب چولہا آہستہ کر رہی تھی۔ مجھے چند لمحے پہلے والی اس کی مصنوعی آنسوؤں والی حرکت یاد آگئی۔

اس روز مجھے علم ہوا تھا کہ مومو بہت اچھی ایکٹریس ہے۔

"حسان!" میں بیڈروم میں بیڈ پر بیٹھا، ٹکیوں کے ساتھ نیک لگائے، ایک تھرلر پڑھ رہا تھا جب مومو مجھے آوازیں دیتی اندر آگئی۔

میں نے کتاب پر سے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا، پھر مسکرا دیا، "جی، شہزادی مہر النساء!"

"اونسو۔ ایک تو اتنا بیک درو نام رکھا ہے آپ نے میرا، اور پھر اس میں شہزادی کا اضافہ بھی کر دیتے ہیں۔" وہ بیڈ کے قریب کھڑی ہو کر خشکی سے بولی۔

"اچھا اچھا، ڈاکٹر صاحب! فرمائیے۔" اس کی کولیگز اور اسپتال کا اسٹاف اسے مہرکتا تھا۔

"ہاں، مجھے ذرا بتائیں، یہ آپ نے بتایا ہے؟" اس نے ایک سفید کانڈ میری جانب بے ہایا۔

"کیا ہے؟" میں نے کتاب ایک سائیڈ پر رکھی اور کانڈ ہاتھ میں لے کر کھولا۔ عینک کو درست کر کے ایک نظری کانڈ پر ڈالی تو میرے سینے میں ایک ہوک سی اٹھی تھی۔

وہ بارہ سالہ مومو کا اسکیج تھا جو بارہ سالہ ماریہ نے بتایا تھا۔

"یہ آپ نے کب بنایا، حسان؟ اور مجھے کیوں نہیں دکھایا؟ کتنا پیارا ہے نا! مگر آپ نے کلر زیوں نہیں کیے اس میں؟ اور یہ صرف ہونٹوں پر ریڈ رنگ کیوں کیا ہے؟" وہ اپنی دھن میں مگن بولے جا رہی تھی۔ جو وہ سمجھ رہی تھی، کیا مجھے بتانے کی ضرورت ہے؟ میں نے ایک اداسی بھری سانس لے کر سر بیڈ کراؤن سے نکال دیا، پھر کانڈ کو چہرے کے سامنے کر کے دوبارہ دیکھا۔

"ویسے آپ نے کب بنایا یہ؟" وہ میرے سامنے بیڈ پر بیٹھ گئی اور دونوں ہاتھوں سے کھلے بالوں کو سمیٹنے لگی۔

"یہ میں نے نہیں بنایا۔" میں نے کانڈ بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔

بال سمیٹتے اس کے ہاتھ ایک لمحے کو رک گئے۔

"پھر؟" قدرے الجھن سے اس نے مجھے دیکھا۔

"یہ مومو نے بنایا تھا۔"

"مگر یہ میں نے نہیں بنایا۔" گود میں رکھے کبچر اٹھا کر بالوں کو اس میں جکڑتے ہوئے وہ اطمینان سے بولی۔

"تم نے نہیں۔ میری ایک اور مومو بھی تھی۔" میں نے بغور مومو کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا۔ وہ سوا یہ عمر سادہ نگاہوں سے میری جانب دیکھ رہی تھی۔

"ایک لڑکی تھی ماریہ۔ میری اکیڈمی میں آیا کرتی تھی۔ اس کا نیک نیم بھی مومو تھا۔ میری اس سے اچھی خاصی دوستی ہو گئی تھی۔" میں نے پھر کن انکھوں سے اس کے چہرے کو دیکھا۔

وہ بہت دھیان سے میری بات سن رہی تھی۔ ماتھے سے ہاں پھر نکل کر چہرے پر آگئے تھے، مگر وہ میری جانب پوری طرح متوجہ ہونے کے باعث محسوس نہیں کر پاتی تھی۔

"مومو۔! تمہیں برا نہیں لگا کہ میری ایک دوست بھی تھی؟" اس کے شفاف اور کسی قسم کی رقابت سے بے نیاز چہرے کو دیکھ کر میں نے نیک آکر پوچھا۔

"برا کیوں لگے گا؟" اس نے حیران ہو کر مجھے دیکھا۔

"یہی کہ میں تم سے محبت کا دعویٰ دار ہوں اور دوسری جانب تمہاری غیر موجودگی میں، میں نے ایک لڑکی سے دوستی کی تھی۔"

"ارے نہیں حسان! میں یہاں سے آپ کو کسی دندے یا رشتے کا پابند کر کے تو نہیں کر کے گئی تھی۔ جس طرح میں آپ کی جانب سے آزاد تھی۔ اس طرح آپ بھی میری جانب سے آزاد تھے۔ خیر آپ اس لڑکی کا بتا رہے تھے۔ مومو کا کیا یہ وہی لڑکی تھی جس کے لیے آپ نے سیٹ خالی رکھی تھی؟" مومو نے فوراً بوجھ لیا تھا۔ وہ جتنی سزا لگتی تھی؟ تھی نہیں۔

"ہاں، یہ وہی تھی اور اس سے پہلے کب۔"

"تم واقعتاً کسی غلط فہمی کا شکار ہو جاؤ، میں تمہیں بتاؤں کہ وہ ایک بارہ سال کی بچی تھی اور مجھے اس کی طرح عزیز تھی۔"

"میں غلط فہمی کا شکار کیوں ہوں گی؟ آپ کی طرح شکی ذہنیت نہیں ہے میری۔" وہ ہنس کر بولی تھی۔ "بہت اعتبار ہے آپ پر۔"

میں اسے ماریہ کے بارے میں بتانے لگا۔ کس طرح اس کی سوتیلی ماں نے اسے گھر سے نکال کر ہسپتال میں داخل کر دیا، اور کس طرح وہ ایک خطرناک آپریشن کی

وجہ سے فوت ہو گئی۔ جب میں نے مومو کو بتایا کہ آخری رات میں اس کے ساتھ تھا، اور اس نے میرے سامنے مومو کا اسکیج بنا کر یہ کہا تھا کہ "آپ اپنی مومو کو متالیں۔" تو مومو بے اختیار رونے لگی تھی۔ وہ ایسی ہی تھی، دوسروں کے دکھ درد پر رونے والی، ہمدردی لڑکی۔

اس کی آنکھوں سے گرتے آنسو دیکھ کر میں نے بے اختیار سوچا تھا، مومو نے یہ کیوں کہا کہ اسے مجھ پر اعتبار ہے؟

تو کیا مجھے مومو پر اعتبار نہیں ہے؟

مومو نے بچپن میں کبھی میرا اسکیج نہیں بنایا تھا، یہ رویہ اس نے شادی کے بعد بھی برقرار رکھا تھا۔ فرق صرف اتنا پڑا تھا کہ پہلے وہ مجھے اس خاص "سلوک" کی وجہ نہیں بتاتی تھی، البتہ اب اس نے جھپٹتے ہوئے بتا دیا تھا۔

"مجھے ڈر لگتا ہے کہ میں غلط سلطہ بنا دوں۔" ہاں، مومو کو ڈر بہت لگا کر تھا۔

کبھی اس سے کسی سالن میں نمک مرچ تیز یا کم ہو جانا، یا پھر چاول چپک جاتے تو وہ سارا کھانا اٹھا کر فریج میں چھپا دیتی اور میرے آنے سے قبل ہی ہوٹل سے کچھ منگوا لیتی یا کوئی اور چیز پکالیا کرتی تھی۔ اگر میں فریج سے خراب ہوا پکوان ڈھونڈ لوں تو ٹھیک ورنہ خود سے وہ مجھے کبھی نہیں بتاتی تھی۔

ایک دفعہ سات سننگنز میں مومو نے بڑوسن مسز ظاہر کا پورٹریٹ بنایا، مگر آخری دن اس نے یہ کہہ کر "کینوس پر پینٹ کر گیا تھا" تصویر ضائع ہو گئی ہے۔ "چند دن بعد مجھے وہ پینٹنگ اس کی الماری سے مل گئی۔ اس میں وہ چہرے کی ساخت ٹھیک سے نہیں بنا سکی تھی۔ میں نے ہنس کر پینٹنگ واپس رکھ دی۔ اگر وہ عادت سے مجبور ہو کر اپنی غلطی کو چھپانا چاہتی ہے تو مجھے براہ غفلت نہیں کرنا چاہیے۔

مومو بہت سی باتیں دوسروں کی ناراضی کے خوف سے انہیں نہیں بتایا کرتی تھی۔ وہ فطری طور پر بہت بزدل تھی۔

مگر مومو محاسن بہت تھی۔ جنہاں اسے میری ضروریات کا کہے بغیر علم ہو جاتا، وہاں وہ میرے احساسات تک بھی رسائی حاصل کر لیتی تھی۔ وہ جانتی تھی، میں اپنی بڑھتی ہوئی عمر کے بارے میں احساس کمتری کا شکار ہوں، اس لیے اگر

کوئی فرد کسی پارٹی میں ہم دونوں کی عمروں کے تفاوت پر تبصرہ کر رہی لیکن تو وہ جو بہت ناگس تھی، لگی لپٹی رکھے بغیر کھڑی کھڑی سنا دیتی تھی۔

مومو میرے ساتھ خوش تھی اور وہ خوش تھی تو میں بھی خوش تھا۔ عمروں کے فرق سے کیا ہوتا ہے؟ ہماری عمروں میں بائیس برس کا فرق تھا مگر ہماری شادی کے بعد گزرنے والا ہر برس پہلے سے زیادہ ہمیں ایک دوسرے کے قریب لے آتا تھا۔ ہم دونوں ایک مثالی جوڑے تھے۔ پرسکون خوش اور مطمئن۔

تو یہ تھی میری کہانی۔ میری اور مہر النساء کی کہانی جو بعض لوگوں کو کسی بھی عام سی لوانسٹوری کی طرح لگے گی تو بعض کو محبت کی ایک طویل داستان۔ وہ کیا فقرہ ہوتا ہے خیری نیلز کے آخر میں؟ ہاں۔ یاد آیا۔

”اور وہ ہنسی خوشی رہنے لگے۔“

تو میں اپنی داستان کا اختتام بھی اسی فقرے سے کرتا ہوں۔ میں ڈاکٹر حسان رضا جس نے ڈاکٹر مہر النساء حیدر سے بے حد محبت کی طویل مسافت کے بعد شادی کر لی اور یوں ہم دونوں ہنسی خوشی رہنے لگے یہ تھا ایک اچھی کہانی کا اچھا خوشگوار انجام۔

کاش کہ میں یہ لکھ سکتا۔ کاش میں اپنی کہانی کو یہیں ختم کر سکتا۔ لیکن نہیں، ابھی میری اور مومو کی داستان اپنے اختتام کو نہیں پہنچی۔ ابھی تو بہت کچھ باقی ہے کیونکہ حقیقی زندگی میں ”ہنسی خوشی“ نام کی کوئی شے نہیں ہوتی۔

یہ مومو کی کہانی ہے اور یہ مہر النساء کی کہانی ہے اور عورت کی محبت کی داستانوں کے اختتام پر ہنسی خوشی نہیں ہوا کرتا۔ یہی بتانے کے لیے تو میں یہ داستان آپ کو سنارہا ہوں۔

اگر آپ کسی رومانٹک قسم کی افسانوی سی ”ہنسی خوشی“ کے مستلاشی ہیں تو یہ داستان یہیں ختم کر ڈالیں۔ مجھے پلٹ کر کوئی رومانوی سی کہانی کھولیں جس میں نوجوان اور بے تحاشا خوبصورت لڑکا لڑکی معمولی رکاوٹوں کے بعد شادی کر کے ہنسی خوشی رہنے لگ جاتے ہیں۔

لیکن اگر آپ عورت کی اصل محبت اور عورت کی محبت کے اصل کو جاننا چاہتے ہیں اس کی حقیقت کو سمجھنا چاہتے ہیں تو پھر آپ کو میرے ساتھ چند برس اور آگے چلنا ہوگا۔

میں نے جوں ہی سگریٹ کے پکٹ کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا مومو نے میرے سامنے میز پر الٹش ٹرے رکھی۔

”کم یا کریں حسان!“ تھوڑی دیر بعد جب میں عادتاً سگریٹ کے کش لگا رہا تھا، کچن میں کام کرتی مومو نے خفگی سے کہا تھا۔ ”آپ کو یہاں ہے یہ آپ کو نقصان دے گی۔“

میں نے ایک نظر کچن میں ڈاکٹر کے پیچھے کھڑی مومو پر ڈالی۔ آدھے بازوؤں والی اسٹائنلش سی قمیص شلوار پہنے ہوئے ایک کندھے پر ڈالے وہ دونوں ہاتھ کمر پر رکھے مجھے گھور رہی تھی۔ اس کے ماتھے پر اس کی بھوری پونی ٹیل سے بال نکل کر لہرا رہے تھے۔ شادی کے بعد سے لے کر اب تک اس نے بالوں کی لینتھ اور کٹنگ نہیں بدل تھی۔

”روز نہیں پتا!“ میں نے سگریٹ کا آخری کش لگا کر اسے نہایت فرماں برداری سے الٹش ٹرے میں پھینک دیا۔ ”اب کیا فائدہ؟ اب تو ختم بھی ہو چکی تھی۔“ میری چیٹنگ کو بھانپ کر وہ برا سامنہ بنائے رخ موڑ کر سبزی کاٹنے لگی۔

ہماری شادی کے ان آٹھ برسوں میں مومو نے کبھی نوکرائی نہیں رکھی تھی۔ وہ ہر کام خود کرتی تھی۔ ڈسٹنگ سے گارڈنگ تک، کپڑوں کی دھلائی سے پیکنگ تک، مومو کو کبھی میبلر کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ یہ اس کا گھر تھا وہ ہنسی تھی ”مجھے اس کے درد دیوار سے اس کے گھلوں اس کی مٹی تک سے پیار ہے۔“ اور وہ اتنے ہی پیار سے اس گھر کے تمام کام کرتی تھی۔ اس نے پریکٹس چھوڑ دی تھی اس نے آرٹ اکیڈمی چھوڑ دی تھی وہ بس اپنے گھر سے محبت کرتی تھی اسے سبائی، سنواری رہتی تھی۔

میں چینل بدلتے ہوئے کن اکھیوں سے اس کا جائزہ لے رہا تھا مجھے بھوک لگ رہی تھی، صبح ناشتہ نہیں کیا تھا اور اب مومو دھیرے دھیرے کھانے کی تیاری کر رہی تھی۔

”کھانے میں دیر ہے فی الحال یہی کھاؤ۔“ اسی وقت اس نے آلیٹ اور توس میرے سامنے رکھے۔

”تمہیں کیسے پتا چلا مجھے بھوک لگی ہے؟“ باوجود کوشش اور اتنے برسوں کی پریکٹس کے میں ہر بار اپنی حیرت چھپا نہیں پاتا تھا۔ جواباً وہ مسکرائی۔ مسکرانے سے

اس کی آنکھوں کے گرد دھیمی دھیمی سی لکیریں پڑ جاتی تھیں، ان لکیروں کے علاوہ کوئی علامت نہیں تھی جو اس کو جو بیس برس کا بتاتی تھی۔ وہ اب بھی بائیس تیس سالہ لڑکیوں کی طرح دلکش اور اسٹارٹ تھی۔

”بس مجھے پتا ہے۔“ وہ کہہ کر کچن میں واپس چلی گئی۔

میں نے پلیٹ اپنی جانب کھسکا لی اور نیوڈ دیکھتے ہوئے پلیٹ کھانے لگا یکدم مجھے پیاس لگی۔

”یہ لیس۔ پانی۔“ مومو نے پانی کا لبالب بھرا ہوا گلاس میرے سامنے میز پر رکھا۔

”مومو تم۔۔۔“ میں گہری سانس بھر کر رہ گیا۔ وہ کچن میں واپس چلی گئی۔

میں نے آلیٹ کھاتے ہوئے چینل بدلا۔ ایک چینل پر ڈرامہ آرہا تھا ڈرامہ تو پتا نہیں کون سا تھا مگر اس میں ایک باکرا (خالبہ) ہمایوں سعید ایک روتے ہوئے چھوٹے سے بچے کو اٹھائے چپ کرانے کی کوشش کر رہا تھا۔

سبزی کاٹتے مومو کے ہاتھ ایک دم رک گئے۔ بچے کے رونے کی آواز پر اس نے مڑ کر کئی سی اسکرین کو دیکھا۔ اس کے چہرے کا رنگ ایک دم سفید سا پڑ گیا تھا۔ وہ چھری پلیٹ میں چھوڑ کر کچن سے نکل کر لوگ روم میں لڑکی کے قریب آئی۔ اس کی نگاہیں اسکرین پر جمی گئیں۔ اس کے لب ہونے سے کپکپا رہے تھے۔

میں نے اس کے چہرے کو نگاہوں کے حصار میں لیتے ہوئے چینل بدل ڈالا۔

اس کی حرکت ٹوٹی تھی۔ اس نے چونک کر گردن پھیر کر مجھے دیکھا، پھر سر جھٹک کر تیزی سے کچن میں واپس چلی گئی۔

اس کا یہ ”رہنمائی“ میں پچھلے کئی برس سے دیکھ رہا تھا۔ وہ جو میں نے کہا تھا، ہر کہانی کے اختتام پر پپسی اینڈنگ نہیں ہوا کرتا تو ہمارے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔

ہمارے ہاں اولاد نہیں تھی۔

اس بات کا مجھے نہیں مومو پر خاطر خواہ اثر ہوا تھا۔ شادی کے بعد اکثر وہ ڈپریشن ہو جایا کرتی تھی۔ کبھی کبھار ڈپریشن کے ہر دورے بہت شدید ہوا کرتے تھے وہ کڑواٹ کو نیند میں بولتی بھی تھی۔ میں سننے کی کوشش کرتا، مگر اب میں بوڑھا ہو چکا تھا۔ میری حسرت کی بارگاہی 50 فیصد تک گھٹ چکی تھی۔ باوجود کوشش کے میں سمجھ نہیں پایا تھا کہ اس کے ساتھ مسئلہ کیا ہے۔

پھر ایک روز میں نے اس سے پوچھ ہی لیا۔ ”میں باجھ ہوں حسان!“ وہ ایک دم رونے لگی تھی۔ ”میں کبھی ماں نہیں بن سکتی۔ میں آپ کو اولاد نہیں دے سکوں گی۔“

”مجھے نہیں چاہیے اولاد مومو! بس تم خوش رہا کرو۔“ وہ آنسو پونچھ کر سر ہلاتی، مگر میں جانتا تھا یہ غم اس کو اندر ہی اندر کھا رہا تھا، یوں لگتا تھا جیسے اس کے وجود کا کوئی حصہ بچ رہا ہے، گم ہو گیا تھا۔

خیالات کی رو میں بھٹکے، میں نے ایک دم چونک کر مومو کو دیکھا۔ وہ خاموشی سے نیچا لب بے دردی سے کپکتی ہوئی، سبزی کاٹ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بہہ نکلنے کو تیار تھیں۔

میں نے آسٹ سے اسے آلیٹ کر سر جھٹک لیا۔

”کب لائٹ آف کرو گی؟“ ڈرائنگ ٹیبل کے سامنے اسٹول پر بیٹھی مومو کو نگاہوں کے حصار میں لیتے ہوئے میں نے مسکرا کر پوچھا۔

وہ جو چہرے کی کلیننگ کر رہی تھی، میرے یوں دیکھنے پر جھینپ کر مسکرائی۔

”کدیتی ہوں ڈاکٹر صاحب! ذرا کلیننگ تو کر لوں۔“ وہ نگاہوں کو نیچے جوکائے جھپٹے جھپٹے انداز میں بولی۔

میں نے مسکرا کر ساتھ رکھا فیشن میگزین اٹھایا اور یونہی صفحے پلٹ کر نہایت غیر دلچسپی سے دیکھنے لگا۔

”مومو! یہ اس ایکٹرس کا کیا نام ہے؟“ میں نے ایک اداکارہ کی تصویر دیکھتے ہوئے جیسے یاد کرتے ہوئے مومو سے پوچھا۔ ایکٹرز کے نام یاد رکھنے میں میں ہمیشہ سے کمزور رہا تھا۔

مونسجرا انزرو چہرے پر ملتے ہوئے وہ اٹھ کر میرے قریب آگئی اور قد درے جھک کر صفحے پر دیکھا۔

”ذہنی طور پر نیچے لکھا تو ہوا ہے۔“ وہ میرے ساتھ پیٹ پر بیٹھ کر اب ڈیجیٹل مور صاحب پر لکھا گیا چنپنا کالم پڑھنے لگی تھی۔ اس کے ہاتھ ابھی تک چہرے پر مونسجرا انزرو مل رہے تھے۔

”اچھا۔ میری عینک نہیں تھی اس لیے پڑھ نہیں سکا۔ اب لائٹ آف کرونا!“

وہ میری بات سنے بغیر میگزین پر جھکی قدرے حیرت سے کچھ پڑھ رہی تھی۔

”حسان! یہ لڑکا کون ہے؟“ اس کے چہرے پر متحرک ہاتھ اب رک چکے تھے۔ میں نے ڈیڑھ سوڑے کے ساتھ تصویر میں کھڑے لڑکے پر بے توجہی سے نگاہ ڈالی اور کمپین پر بھا۔

”کوئی ایشن صاحب ہیں۔“

”ہیں؟“ اس نے میگزین میرے ہاتھ سے لے لیا۔

”یہ تو مجھے بالکل۔“

”تو کیا ہو گیا؟“ میں نے جمائی بمشکل روکی۔ مجھے نیند آرہی تھی اور وہ محترمہ لائٹ آف کرنے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔

”کون ہے بھئی؟ ڈیڑھ سوڑے کا بیٹا ہے کیا؟“

”ارے نہیں حسان بیٹا کہاں۔۔۔ بوائے فرینڈ ہے اس کا۔ مگر یہ تو بالکل مین ایجر لگتا ہے۔ اف تو بس یہ ڈیڑھ سوڑے کو اس عمر میں کیا سوچھی؟“ اب وہ بڑے شوق سے آریکل پڑھ رہی تھی۔ میں بوسا ہو گیا۔

”اس عمر میں کیا مطلب؟ وہ تو اب بھی جوان لگتی ہے۔“

”جوان کہاں ہے؟ مجھ سے بھی بڑی ہوگی اور یہ ایشن تو اس سے آدھی عمر کا ہے۔ لو کرو گل۔ پہلے ڈیڑھ سوڑے اتنے ایجنڈ بروس دس سے شادی کی تھی تب یہ جوان تھی اور بروس دس بڑی عمر کا۔ پھر اس سے طلاق لے لی اور اب بیٹیاں جوان ہو رہی ہیں تو آدھی عمر کا بوائے فرینڈ! لاخوالا لاخوالا۔“

”بس ہوتی ہیں کچھ عورتیں۔ جنہیں۔۔۔“ الیکٹرا سکیلیس کا شکار ”کتے کتے رک گیا۔ یکدم میں بالکل سن سا ہو گیا تھا۔

کئی سال پہلے میں نے مومو کو کہا تھا کہ وہ الیکٹرا سکیلیس کا شکار ہے مگر اب مجھے یقین سا ہو چکا تھا کہ وہ بالکل نارمل ہے اور اس نے مجھ سے شادی کسی نفسیاتی جس کی تسکین کے لیے نہیں بلکہ میری محبت میں کی ہے۔

لیکن اس رات اچانک مجھے وہ بات یاد آگئی تھی۔ پتا نہیں کیوں میں ایک دم بے زار سا ہو گیا تھا۔

”لائٹ آف کرو۔“ میں بستر پر کوٹ دیوار کی طرف کر کے لیٹ گیا۔

”سو گئے؟“ میگزین سائیڈ پر رک کر مومو نے مجھے پکارا تھا۔

میں نے جواب نہیں دیا۔ میری طبیعت عجیب سی ہو رہی تھی۔

دن میں کتنی بار میں اپنی شکل دیکھتا تھا۔ کیا میں اس قابل تھا کہ مومو جیسی خوب صورت پڑھی لکھی اور خود انحصار لڑکی مجھ سے شادی کرتی؟

میں ایک عام سی شکل کا عام سا مرد تھا۔ میرے اندر ظاہری طور پر سوائے ایک گریس فل پر سٹائلی کے کوئی خوبی نہ تھی۔

میرا احساس کمتری نہیں بلکہ یہ کچھ اور تھا۔ جو مجھے یہ سب کچھ سوچنے پر مجبور کر رہا تھا۔

ایک مبہم سا خیال جسے میں ان گزرے برسوں میں بھلا چکا تھا ایک دفعہ پھر میرے ذہن میں واپس آچکا تھا۔

وہ خیال کیا تھا کیا مجھے یہ بتانے کی ضرورت ہے؟

* * *

”ڈاکٹر صاحب کل میرے ساتھ شاپنگ پر تو چلیں۔“

میرے ساتھ پارک میں واک کرتے ہوئے ایک دم مومو نے فرمائش کی۔ جب اسے مجھ سے کوئی کام ہوتا وہ مجھے ڈاکٹر صاحب کہتی تھی۔

”اچھا۔ سوچیں گے۔“ میں نے ٹال دیا۔ وہ قدرے مایوس سی ہو کر پتھری رویوش پر چلنے لگی۔

وہ آگے چل رہی تھی میں پیچھے تھا۔ اطراف میں شام کے نیلگوں سائے اپنے پر پھیلا رہے تھے۔ اسٹریٹ لمپس جل اٹھے تھے، آفس سے گھر واپس آنے والوں کی گاڑیاں اور موٹر سائیکلوں کا شور پارک کے پرسکون ماحول میں خلل ڈال رہا تھا۔ میں اور مومو روز اس ٹائم گھنٹہ بھر واک کرتے تھے۔ یہ وہ گھنٹہ ہوتا تھا جب ہم دونوں بالکل خاموشی سے ساتھ ساتھ چلتے تھے ایک دوسرے سے کوئی بات نہ کرتے، بس اپنی اپنی سوچوں کے بھنور میں پھنسے رہتے۔ کبھی میں آگے نکل جاتا تو کبھی مومو۔۔۔ وہ گھنٹہ بھر پرسکون ہوتا تھا۔ یاں اگر مومو کو کوئی فرمائش کرنا ہوتی تو وہ اسی گھنٹے میں کرتی تھی۔ جیسے اس روز اس نے کی تھی۔

میں اس سے دو قدم پیچھے چلتے ہوئے اس کی پشت کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے شولڈر کٹ بال ہمیشہ کی طرح کبچر میں ہانپ بندھے تھے۔ وہ سر جھکائے کچھ سوچتے ہوئے چل رہی تھی جب دفعتاً ”ٹھنک کر رکی اور دائیں جانب دیکھا۔“

میں نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں نظریں دوڑائیں۔ ہمارے سے چند قدم کے فاصلے پر دائیں جانب ایک چھوٹا سا سائٹ آئڈ برس کا بچہ اپنی ماں سے باتیں کرنا ہوا گزر رہا تھا۔ اس نے سر پر لی کیپ پہن رکھی تھی اور جلتے ہوئے پاں کی انگلی پکڑ رکھی تھی۔ مومو ٹھنک کر ان کو دیکھ رہی تھی۔ وہ دونوں مخالف سمت سے آرہے تھے ہمارے قریب پہنچ کر ایک دفعہ پھر ہم سے دور جانے لگے تو مومو چہرہ موڑ کر ان کو دیکھنے لگی۔ میں اس سے چند قدم پیچھے تھا اب مجھے اس کا چہرہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے اپنی نگاہیں اس سات آئڈ سال کے بچے کی پشت پر جمائے مومو کی بڑی لائبی آنکھوں میں اتنی بے بسی اتنی حسرت اور اتنا کرب تھا کہ میں نے بے اختیار آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھاما۔ ”چلو مومو! گھر چلو۔“ میں اسے اس بچے سے دور لے جانا چاہتا تھا۔

مومو نے سختی سے میرا ہاتھ جھٹک دیا۔ وہ اب بھی اس بچے کو اپنی ماں سے دور جانا دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں شدت ضبط سے سرخ ہو رہی تھیں۔

”مومو!“ میں نے اسے دوبارہ پکارا۔ اس نے چونک کر مجھے دیکھا، پھر ایک دم مڑی اور بھاگتی ہوئی پارک سے باہر نکلنے والے رستے کی جانب جانے لگی۔

میری عمر اب بھانسنے والی نہیں تھی سو میں تیز تیز چلتا ہوا اس کے پیچھے گیا۔ مجھے پتا تھا وہ گھر جا رہی ہے۔ اس کے پاس رونے کے لیے وہی جگہ تھی۔

”مومو!“ میں نے دروازہ بجایا ”مومو! دروازہ کھولو۔۔۔ پلیز کھولو!“

مگر اس نے دروازہ نہ کھولا۔۔۔ شدید ڈپریشن میں وہ خود کو کمرے میں بند کر لیا کرتی تھی۔ آج بھی اس نے یونہی کیا تھا۔

”مومو! دروازہ کھولو۔“ میں نے ایک دفعہ پھر کما کر اس نے دروازہ نہیں کھولا۔

میں نے دروازے میں نصب لاک کے کی ہول سے اندر جھانکا۔ وہ دروازے کے بالکل سامنے والی دیوار سے ٹیک لگائے زمین پر بیٹھی تھی۔ اس کا سر اس کے گھٹنوں پر تھا۔ اس کا کبچر کہیں گر گیا تھا اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ وہ خود بھی ٹوٹی ہوئی بکھری بکھری لگ رہی تھی۔ اس کی دلی سسکیوں کی آواز اور ہولے ہولے لڑنا جو دبختی بتا رہا تھا کہ وہ رو رہی تھی۔

شادی کے بعد یہ پہلی دفعہ تھا جب وہ بے اولادی کے غم میں یوں پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی۔ اس طرح بچکیوں کے ساتھ تو وہ صرف ایک دفعہ اپنے گھر کے ڈرائنگ روم کے صوفے پر بیٹھ کر روئی تھی۔ کیا مجھے آپ کو یاد دلانے کی ضرورت ہے کہ وہ کیوں روئی تھی؟

”مومو!“ میں نے پھر دروازہ کھٹکھٹایا مگر مومو نے دروازہ نہیں کھولا اس کے رونے میں شدت آگئی تھی۔ اب مجھے سسکیوں کی بجائے اونچی آواز میں رونے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

وہ رو رہی تھی میری مومو رو رہی تھی وہ جسے میں نے صرف ایک دفعہ ایسے روتے دیکھا تھا وہ آج دوسری دفعہ دیے ہی رو رہی تھی۔ پہلی دفعہ جب وہ ایسے روئی تھی اس کے باپ نے چپ چاپ اس کی بات مان لی تھی۔ وہ کہتا تھا۔ ”عمروں کے بے تحاشا فرق والی شادیاں غیر فطری ہوتی ہیں اور جو چیزیں غیر فطری ہوتی ہیں وہ ایک دن ناکام ہو کر اپنی جگہ پر واپس آتی جاتی ہیں۔ ایسی شادیوں سے صرف دل ٹوٹتے ہیں۔“ وہی حیدر میرے لیے مومو کی بات مان گیا تھا۔

آج اس کا باپ زندہ نہیں تھا ورنہ اس کو چپ کر دیتا۔ اس کو منالیتا۔ میں تھا تو مگر مجھے اس کو منانا ہی نہیں آتا تھا اس کے زخموں پر مرہم رکھنا بھی نہیں آتا تھا میں تو کبھی مومو کے پیچھے اسے پکارنے بھی نہیں گیا تھا پھر بھلا میں اب کیسے اسے مناتا؟

اس رات میں اسٹڈی روم میں سو گیا تھا۔ مومو پوری رات روئی رہی تھی۔

* * *

”جلدی آجائے گا حسان!“ میں اس صبح یونیورسٹی کے لیے تیار ہو رہا تھا کہ مومو نے پیچھے سے آکر کہا۔

میں نے کٹھنھی کرتے ہوئے ڈرائنگ ٹیبل کے آئینے میں اپنے پیچھے کھڑی اپنی اسماٹ سی بیوی کا عکس دیکھا۔

”آجائے گا جلدی۔ خیر تو ہے نا؟“ میں نے مسکرا کر اسے دیکھتے ہوئے رفیوم کی شیشی اٹھائی۔ اس نے شیشی میرے ہاتھ سے لے لی۔ میں نے پلٹ کر اسے دیکھا۔

”وہ اصل میں آج صائم آ رہا ہے نا؟“ اس کی چھٹیاں ہیں خالہ نے اسے پاکستان بھیج دیا ہے۔ میں نے کہا۔

خواجہ وہ لاہور میں دوسرے رشتے داروں کے پاس کیوں

رہے۔ اس لیے خالہ کو کہہ دیا کہ چھٹیوں میں وہ ادھر ہی رہے گا۔ آخر میں اور داد بھی خالہ کی طرف رہتے تھے۔ میں نے ٹھیک کہا تھا حسان؟ وہ اب پر فہم مجھ پر اس پر کرتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

”ہاں بالکل ٹھیک کہا۔“ میں نے ہولے سے اس کا گل چھو کر اپنی کتابوں کی جانب بڑھ گیا۔

صارم کے بارے میں مجھے اتنا یاد تھا کہ وہ ہماری شادی پر موجود تھا۔ ایک چھوٹا سا پیارا سا دس بارہ سالہ بچہ چلو اچھا تھا وہ آ رہا تھا۔ اس کے آنے سے گھر میں رونق ہو جائے گی اور مومو جو اپنے کزنز کو اتنا پس کرتی تھی وہ بھی خوش ہو جائے گی۔

یونیورسٹی میں کلاس کے دوران اور پھر بعد میں بھی صارم کا خیال میرے ذہن سے بالکل نکل چکا تھا۔ میرا دن خاصا مصروف گزارا تھا۔ یونیورسٹی کے بعد مجھے بینک میں کسی کام سے جانا پڑ گیا وہاں سے نکلا تو ایک پرانا دوست راستے میں مل گیا۔ اسی چکر میں شام ہو گئی، مومو کی تاکید میرے ذہن سے بالکل نکل چکی تھی۔ سو آرام سے پانچ بجے کے قریب گھر پہنچا۔

لاؤنج میں داخل ہوتے ہی میں نے ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے ہوئے کوٹ اتار کر صوفے پر رکھا۔ اپنی کتابیں سینئر ٹیبل پر رکھ کر میں اپنے کمرے کی جانب بڑھنے ہی لگا تھا کہ ایک چکن کاؤنٹر کے ساتھ کھڑے اس اجنبی کو دیکھ کر چونک سا گیا۔

جھپٹ سے نکلتا قد، چوڑے کندھے، انہیلنک جسم، وہ جو بھی تھا اچھا خاصا باڈی بلڈرنگ رہا تھا۔ وہ میری جانب بٹ کر کے کھڑا غالباً جس پی رہا تھا۔ بلیک پینٹ پر سفید ٹی شرٹ میں ملبوس اجنبی نوجوان کو اپنے گھر میں دیکھ کر میں بری طرح ٹھنکا تھا۔

”ایکسکیوز می؟“ میری آواز پر وہ جس پیتے پیتے کسی خیال سے چونکا اور پلٹ کر مجھے دیکھا۔ اس نے شاید میرے آنے کی آہٹ نہیں سنی تھی۔

پشت سے دیکھنے پر وہ مجھے پورا مرد لگا تھا مگر اس کی شکل پر ابھی لڑکپن تھا۔ لمبے قد، چوڑے کندھوں اور مسلسل کی وجہ سے وہ اپنی عمر سے تھوڑا بڑا لگتا تھا۔

”السلام علیکم سر۔! میں صارم ہوں۔“ اس نے جس کا گلاس کاؤنٹر پر رکھ کر قدرے لاپرواہ انداز میں تعارف کرایا۔ مجھے تو گویا جھٹکا لگا تھا۔ صارم تو میرے ذہن میں

صرف دس گیارہ سال کا بچہ تھا، مگر یہ تو بھرپور مرد لگتا تھا۔ ہماری شادی کے وقت وہ نو یا دس سال کا تھا تو اب سترہ اٹھارہ برس کا ہو گا۔ وقت کتنی جلدی گزر جاتا ہے، پتا ہی نہیں چلتا۔

”اوہ صارم۔! سوری میں پہچانا نہیں۔ مومو کے کزن ہو تم، رائٹ۔؟“ میں نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا، مگر میرے انداز میں گرم جوشی مفقود تھی۔ صارم نے بھی قدرے سرد انداز میں سلام کا جواب دیا۔

”ارے حسان، آپ آگے؟“ اسی لمحے مومو بند روم کا دروازہ کھول کر باہر آئی۔ اسی لمحے مجھے یاد آیا اس نے مجھے جلدی آنے کو کہا تھا۔

”حسان! یہ صارم ہے۔ بڑا ہو گیا ہے نا؟“ وہ خوشی خوشی تعارف کر رہی تھی۔ ”اور صارم! یہ میرے ہرینڈ حسان ہیں۔“ اس نے ایک دفعہ بھی میرے دیر سے آنے پر شکوہ نہ کیا۔

”مل چکا ہوں۔“ میں نے آواز میں گرم جوشی پیدا کرنے کی کوشش کی مگر مجھے وہ لا تعلق نظر آنے والا مغرور سا لڑکا پتا نہیں کیوں پسند نہیں آتا تھا۔

”مہ مہ۔ میں اندر کمرے میں ہوں۔ کھانا کھائے تو ڈالیتا۔“ میں کوٹ اتار کر اندر چلا گیا۔

نہا کر میرا خیال تھا کہ میں فریش ہو جاؤں گا مگر یہ نہیں کیوں عجیب سی بے زاری میرے وجود پر چھائی ہوئی تھی۔ میں یونہی بستر پر لیٹ گیا اور چھت کو گھورنے لگا۔ جب میں نیشن میں ہوں یا پریشان ہوں تو یونہی لیٹ جاتا تھا۔ مومو فوراً ”میرے پاس آکر فکر مندی سے وجہ پوچھتی تھی اور میں اسے بتا کر دل کا بوجھ ہلکا کر لیتا تھا۔ مگر اس شام مومو پوچھنے نہیں آئی۔ وہ اپنے کزن کی خاطر مدارات میں مصروف تھی۔ اگر وہ پوچھتی بھی تو میں کیا جاتا، مجھے تو خود نہیں پتا تھا کہ مجھے پریشانی کس بات کی ہے۔

رات کھانے پر وہ مجھے بلانے آئی تو میں خاموشی سے اٹھ کر باہر آ گیا۔ کچن میں رکھی ٹیبل کے گرد کھی چار کرسیوں میں سے میری مخصوص سیٹ پر صارم بیٹھا تھا۔ مجھے کچھ کوفت سی ہوئی۔ میں ایک دوسری کرسی چھینچ کر بیٹھ گیا۔ مومو کھانا لگانے میں اتنی مگن تھی کہ اسے احساس بھی نہ ہوا کہ صارم میری کرسی پر بیٹھا ہے یا شاید مومو میری جگہ کسی اور کو دینے پر رضامند ہو گئی تھی؟

میں نے ذہن میں آئے وسوسوں کو جھٹک کر اپنی توجہ میز

پر رکھی ڈشیز پر مرکوز کرے کی کوشش کی۔ میکرویز، رشین سلاد، فرائیڈ فش اور چکن واپن ایل اس نے غالباً ”صارم کے لیے بنائے تھے۔ میرے لیے اس نے الگ سے چار گوشت بنایا تھا، مجھے تو خوش ہونا چاہیے تھا کہ میری بیوی کو گھر آئے مہمان کا کتنا خیال تھا، مگر پتا نہیں کیوں مجھے خوشی نہیں ہوئی تھی۔

”یہ لوٹا صارم!“ اس نے میکرویز کی ڈش صارم کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا تھا۔ ”اور ذرا فرائیڈ فش ٹیسٹ کرو، تم فش شوق سے کھاتے ہو نا۔“

اس کو صارم کی پسند ناپسند کا بخوبی علم تھا۔ وہ میرا بہت خیال رکھتی تھی۔ مجھے اچھا لگتا تھا۔ وہ صارم کا بہت خیال رکھ رہی تھی، مجھے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

”حسان! یہ لیس نا!“ اس نے مجھے صرف ایک دفعہ فش کھانے کی آفر کی مگر میں نفی میں سر ہلا کر اپنی پلیٹ پر جھک گیا۔ میں مچھلی نہیں کھاتا تھا، اس لیے اس نے دوبارہ نہیں کہا۔

چند لمحوں کھا کر ہی میں اٹھ گیا۔

”کیا ہوا؟ اچھا نہیں لگا کیا؟“ مجھے اٹھتا دیکھ کر مومو نے حیرت اور فکر مندی سے مجھے دیکھا تھا۔ صارم اسی طرح واقفیت سے کھانا کھا رہا تھا۔

”ہمیں اچھا ہے۔ بس میرا پیٹ بھر گیا ہے۔ اچھا میں سونے جا رہا ہوں۔“ میں اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ مجھے افسوس تھا کہ آج ہم دونوں واک پر نہیں گئے تھے۔ کئی سالوں کی رو میں آج صارم کی وجہ سے ٹوٹی تھی۔ پتا نہیں اور کیا کیا ٹوٹا پاتا تھا۔



چھٹی کے دن میں دیر سے اٹھا تھا، پھر بھی مومو کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ وہ مجھے صبح سویرے اٹھا کر واک پر لے جائے۔ مومو صبح کی واک شام کی واک کی طرح روز نہیں کرتی تھی بلکہ صرف چھٹی والے روز کرتی تھی۔ میں درگنگ ڈیز میں واک پر جاتا تھا اور چھٹی والے دن عموماً سونا پسند کرتا تھا مگر مومو ہمیشہ اٹھا دیتی تھی۔

اس چھٹی کے روز اس نے مجھے نہیں اٹھایا اور میں خود ہی اٹھ سوا اٹھ بچے جاگ گیا۔

منہ ہاتھ دھو کر کمرے سے نکلا تو صارم اور مومو کچن میں کھڑے تھے۔ مومو آٹا گوندھتے ہوئے بہت دھیان سے

صارم کی گریجویشن کا کوئی قصہ سن رہی تھی، جبکہ وہ ہنستے ہوئے بتا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں چھری تھی جس سے وہ آلیٹ کے لیے پیاز کاٹ رہا تھا۔

میں خاموشی سے آکر لوٹنگ روم کے وسط میں کھڑا ہو گیا۔ ان دونوں کی میری جانب پشت تھی۔

”اب آگے کیا کرو گے؟ لاء؟“ مومو اسے مخاطب کر کے پوچھتی ہوئی بقیہ آٹا فریج میں واپس رکھنے کے لیے پلیٹی ہی تھی کہ دفعتاً اس کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ اس کی بھوری آنکھوں میں حیرت در آئی تھی۔ ”اتنی جلدی اٹھ گئے آپ؟“

پیاز کاٹتے صارم نے گردن پھیر کر مجھے دیکھا اور سلام کیا۔

”وعلیکم السلام۔“ میں چاہنے کے باوجود بھی لمبے کو شگفتہ نہیں کر سکا اور رخ موڑ کر مومو کو مخاطب کیا۔ ”واک پر نہیں چلنا؟“

”آج رہنے دیں حسان آج تو صارم آیا ہوا ہے۔“

وہ سمولت سے کہہ کر صارم کو دیکھ کر مسکرائی تھی۔ اس کی بڑی بھوری آنکھوں میں ایک عجیب سا رنگ تھا جو میرے لیے انوکھا تھا۔ یہ بہت پیار بھرا مگر منفرد سا رنگ تھا۔

”کل بھی واک میں کڑی تھی۔“ میں نے دبا دبا شکوہ کیا۔ مجھے کوئی پروا نہ تھی کہ صارم لب بچھے تمام شکوے سن رہا تھا۔

”اس اوکے حسان واک تو ہوتی رہے گی مگر صارم تو صرف چند دنوں کے لیے آیا ہے۔“ اس کے انداز میں اطمینان تھا، میں اندر ہی اندر ایک عجیب سی کیفیت کا شکار ہو چکا تھا۔

میں لوٹنگ روم میں صوفے پر بیٹھ کر اخبار دیکھنے لگا۔ کوئی نئی خبر نہ تھی۔ ایل ایف او، صدارتی انتخاب، صدر کے دردی آمارے کا رپاؤ، عراق جنگ۔

کچن سے مومو اور صارم کی باتوں کی آوازیں آرہی تھیں۔

میں نے اخبار قدرے بے زاری سے میز پر پھینک دیا اور تیزی سے داخلی دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ مومو مجھے بھلا کیوں روکتی، اس کے خیال میں واک پر جا رہا تھا۔



”میں تو جیلمنسی کے ساتھ ہوں اور آپ۔؟“



پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیش کش

(WWW.PAKSOCIETY.COM)

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے آپ کیلئے پیش کیا۔

ہم خاص کیوں ہیں؟؟؟؟؟

یہ واحد ویب سائٹ ہے جہاں سے تمام ماہنامہ ڈائجسٹ، ناول، عمران سیریز، شاعری کی کتابیں، بچوں کی کہانیاں، اور اسلامی کتابیں ڈائریکٹ ڈاؤن لوڈ کرنے کے ساتھ ساتھ آن لائن پڑھ بھی سکتے ہیں۔



fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف

اگر آپ کو ویب سائٹ پسند آئی ہے تو پوسٹ کے آخر میں اپنا تبصرہ ضرور دیں۔

اپنا تبصرہ صرف پوسٹ تک محدود رکھیں۔ درخواست کے لئے رابطہ کا صفحہ استعمال کریں۔

اپنے دوست احباب کو بھی پاک سوسائٹی کے بارے میں بتائیں۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی انتظامیہ سے مالی تعاون کیجئے۔ تاکہ یہ منفرد ویب

سائٹ آپ کیلئے جاری رکھی جاسکیں۔

پاکستانیوں کے ویب سائٹ

WWW.Paksociety.Com



Library For Pakistan

حصار کی آواز پر میں نے گردن اٹھا کر دیکھا۔ وہ لونگ
روم میں پہنچے کاریٹر پر رکھے کشن پر بیٹھا مومو سے مخاطب
تھا۔ میں نے فی وی اسکرین کو دیکھا، جینٹلمن اور مائچسٹر
یونائیٹڈ کا بیج آ رہا تھا۔ میں نے فوراً اخبار سائیڈ پر رکھ دیا۔
”مائچسٹر یونائیٹڈ کا بیج ہے؟“ قدرے خوشی سے میں نے
ریموٹ اٹھا کر آواز اچھی کی۔ مائچسٹر یونائیٹڈ میری فیورٹ
ٹیم تھی۔

مومو ہاتھ میں چلغوزوں کی پلیٹ لے آئی تھی۔ یہ اس کی پرانی عادت تھی۔ وہ چلغوزوں کی ڈش خود لے کر ایک ایک چلغوزہ نکال کر مجھے پکڑایا کرتی تھی، خود وہ کبھی نہیں کھاتی تھی۔ وہ صوفے پر میرے ساتھ بیٹھ ہی رہی تھی کہ صارم نے پوچھ لیا۔

”آپ کس کے ساتھ ہیں، مہر؟“ وہ مومو کو مہر کہتا تھا اور یہی بات تھی جو مجھے بری لگتی تھی۔ ٹھیک ہے۔ دونوں کرنز تھے اور آپس میں از حد بے لگافی تھی مگر اس کو خود سے عمر میں بڑی مومو کو ”آپی“ یا ”باجی“ کہتا چاہیے تھا لیکن وہ

”کس کا بیچ ہے؟“ مومو نے ٹی وی اسکرین کو غور سے دیکھا۔ جب بھی کسٹی فٹ بال کلب کا بیچ ہوتا تھا تو مومو ہمیشہ مائیکسز نوٹائیڈ کے ساتھ ہوتے تھے۔ مجھے پتا تھا اب بھی وہ میرے ساتھ ہی ہوگی۔

”جیل سی اور ایم یو کا۔ میں جیل سی کے ساتھ ہوں اور آپ؟“ وہ گردن موڑے پوچھ رہا تھا۔

”چلو میں بھی چیلنسی کے ساتھ ہوں۔ خوش؟“ اس نے مسکراتے ہوئے چلغوزے کی گری نکالی۔ صارم نے آگے ہاتھ بڑھایا۔ مومن نے گری اس کے ہاتھ پر رکھ دی۔ اس لمحے مجھے اپنا وجود اتنا غیر ضروری بے وقعت اور بے مول لگا تھا کہ میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ کتنی آسانی سے مومن نے کہہ دیا تھا کہ وہ چیلنسی کے ساتھ ہے، وہ کتنی جلدی میرا ساتھ چھوڑ کر صارم کے ساتھ مل گئی تھی۔ مجھے حیرت ہوئی تھی اور اس سے زیادہ دکھ ہوا تھا۔

”میرا خیال ہے مجھے نیند آرہی ہے۔“ اخبار میز پر رکھ کر میں کنبیلے لیجے میں کتا ہوا اندر کمرے میں آگیا۔ میرے اندر بہت کچھ ٹوٹ پھوٹ رہا تھا۔ میں نے بستر پر لیٹ کر کبل اوڑھ لیا اور بازو سے آنکھیں ڈھانپ لیں۔ مگر نیند میری آنکھوں سے کوسوں

دور تھی۔
 دروازہ کھلنے کی آہٹ پر مجھے اندازہ ہوا کہ مومو کمرے
 میں داخل ہوئی ہے۔
 ”حسان! کیا ہوا ہے؟“ وہ میرے قریب بیڈ پر بیٹھ گئی۔
 اس کے لہجے میں فکر مندی تھی۔

میں نے آنکھوں سے بازو نہیں ہٹایا، مگر اس کی آواز سن کر میرے اندر گہی آگ پر ٹھنڈی پھوپھو پڑنے لگی تھی۔ میری مومنہ نہیں بدلی تھی۔ وہ ویسی ہی تھی۔

”حسن! اس نے زبردستی میری آنکھوں سے بازو ہٹا دیا۔ میں نے خاموشی سے اسے دیکھا۔
”کیا ہوا ہے؟ آپ اٹھ کر کیوں آگئے؟“ اس نے
آہستہ سے میرے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر میری طبیعت چیک
کرنے کی سعی کی۔

”مجھے نیند آئی ہے۔“
 ”آپ کو شاید برا لگا کہ میں نے صارم کی سائیڈ کیوں لی۔
 ہے نا؟“ وہ میرے دل کی بات جان گئی تھی۔ میں نے
 جواب نہیں دیا۔

”وہ بہت Sensitive ہے حسان! اگر میں اسے تنہا چھوڑ دیتی تو وہ ہرٹ ہوتا۔“ وہ دھیرے سے میرے ماتھے پر آئے بال ہٹا کر بولی تھی۔

”کیا وہ واقعی نہیں بدلی تھی؟ اسے صدمہ کے ہرٹ ہونے کی پروا بھی مگر میرے ہرٹ ہونے کی نہیں۔“ دل نے کہا تھا۔

”یہ بھی تو دیکھو کہ وہ تمہاری پروا کرتے ہوئے پریشان ہو کر اندر آئی ہے۔“ میرے اندر جیسے کسی نے مجھے سمجھایا۔ میرا قدرے مطمئن سا ہو گیا۔

”اگس اوکے مومو! میں ٹھیک ہوں۔ مجھے واقعی نیند آرہی ہے۔“ میں نے نرمی سے کہا تو وہ کھڑی ہو گئی۔
”اچھا چلیں پھر آب سو جائیں۔“

”اور تم؟“ میرے لبوں سے بے اختیار نکلا۔
 ”نصارم کہہ رہا تھا کہ اسے پرانی کینڈا والی البم دکھاؤں تو اب میچ ختم ہونے کے بعد وہی دکھاؤں گی۔ کچھ دیر لگ جائے گی مجھے۔ پھر باتیں بھی تو بہت کرنی ہیں۔“ وہ کہہ رہی تھی اور میرے اندر دل و دماغ کی جنگ ایک دفعہ پھر چھڑ چکی تھی۔

پتا نہیں وہ کون سی باتیں تھیں جو ان مین وینوں میں ان لوگوں نے نہیں کی تھیں۔

”آپ میرا انتظار مت کیجیے گا۔ سو جائیے گا۔“
اس نے کبل ٹھیک سے میرے اوپر ڈالا۔ لائٹ آف کی اور آہستگی سے دروازہ بند کر کے چلی گئی۔
”الیکٹرک ایکسیس کا شکار عورت جب عمر کی تیسری دہائی میں پہنچتی ہے تو اس کی ترجیحات بدل جاتی ہیں۔ اس کو اپنے سے آدھی عمر کے لڑکوں میں۔“ میں نے سر جھٹکا۔
کافی عرصے پہلے کتابوں میں پڑھی باتیں یاد آ رہی تھیں۔
مگر مومو کو تو الیکٹرک ایکسیس نہیں ہے۔ وہ ایک نارمل لڑکی ہے۔ اس نے مجھ سے محبت کی شادی کی ہے کسی نفسیاتی گروہ کے باعث۔ بندھن نہیں باندھا۔
”محبت کی شادی؟“ کوئی جیسے میرے اندر ہنسا تھا۔
”کبھی خود کو آئینے میں دیکھو کیا تم اس کے ساتھ سوٹ کرتے ہو؟“
وہ رات بھی بے چینی سے کروٹیں بدلتے گزری۔

حالانکہ اس روز یونیورسٹی میں زیادہ کام نہیں تھا پھر بھی میں نجائے کیوں بے حد تھک گیا تھا۔ شاید اس لیے کہ دل و دماغ عجیب بوجھل بن کا شکار تھے۔ فضول دوسووں سے جتنا پیچھا چھڑانے کی کوشش کرتا وہ اتنا ہی مجھے گھیر لیتے تھے۔

گھر آیا تو مومو ہمارے بید روم میں ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی کانوں میں بندے پن رہی تھی۔ اس نے ہال کھول رکھے تھے اور غالباً انہیں بلوڈرائی کر کے سینٹ بھی کیا تھا اور ہلکا سا میک اپ بھی کر رکھا تھا۔ کافی ہنگ شغون جارحیت کے ڈریس میں وہ جی سنوری سی بہت دلکش لگ رہی تھی۔

”بہت اچھی لگ رہی ہو مومو!“ بہت عرصے بعد اسے یوں اپنے لیے سچا سنورا دیکھ کر میری جیسے پورے دن کی تھکن دور ہو گئی تھی۔

اس نے گردن پھیر کر مجھے دیکھا پھر اپنے مخصوص دلنشین انداز میں مسکرائی۔ ”میں تو ہمیشہ ہی اچھی لگتی ہوں۔“ اس کا لہجہ شوخ تھا۔ میں ایک دم چونکا۔

مومو ایسی شوخ کبھی بھی نہیں رہی تھی۔ بہت کم عمری میں وہ بوڑھوں کی طرح سنجیدہ رہنے لگی تھی، لیکن پچھلے کچھ دنوں سے اس کی آواز میں ایک کھنک سی در آئی تھی۔ وہ مجھے پچھلے آٹھ برسوں کے مقابلے میں زیادہ خوش اور

زیادہ جوان لگی تھی۔
”بہت خوش لگ رہی ہو؟ بظاہر میں مسکرا رہا تھا مگر اندر سے میں ناخوش تھا۔

”ہوں۔“ اس نے مسکرا کر شانے اچکا دیے پھر دیرینہ کندھے پر سیٹ کر کے آئینے میں اپنا عکس دیکھ کر بولی۔ ”میں صحیح لگ رہی ہوں نا حسان؟“

میں نے اس کے پیچھے سے آکر اس کے دونوں کندھوں کو تھام لیا۔ ”بہت اچھی لگ رہی ہو مومو۔“ آئینے میں مجھے اس کا خوبصورت چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔

”آپ چلیں گے؟“ بالوں میں انگلیاں پھیر کر انہیں ایک دفعہ پھر سیٹ کرتے ہوئے وہ مصروف سے انداز میں پوچھ رہی تھی۔

”وہ میں بتانا بھول گئی۔ میں اور صارم دامن کوہ جا رہے ہیں اس کو میں دراصل پاکستان گھماتا چاہ رہی تھی۔ آپ چلیں گے ساتھ؟“

اس کے شانوں پر میری گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ ”تو تم اس لیے تیار ہو رہی تھیں؟“
”جی۔۔۔ آپ آئیں گے؟“ اس نے گردن میں موجود فیکلٹس کو ٹھیک کیا۔

میں نے اپنے ہاتھ ایک دم اس کے شانوں سے ہٹا دیے۔ ”نہیں، تم جاؤ۔“ میں اپنے کپڑے نکالنے الماری کی جانب بڑھ گیا۔ میرے اندر ہی اندر کوئی مجھے برچھیوں سے زخمی کر رہا تھا۔

”چلیں۔۔۔ آپ کی مرضی۔“ اس نے پرس اٹھا کر کندھے پر ڈال لیا۔ ”کھانا کھا لیجیے گا، ہم تو شاید رات دیر سے آئیں۔“ وہ مجھے جاتے ہوئے ہدایات کر رہی تھی میں خاموشی سے الماری میں کپڑے ادھر ادھر کرتا رہا۔

”مہرب! چلیں نا!“ باہر سے صارم کی آواز آئی تھی۔
”ارے آ رہی ہوں نا اچھا حسان خدا حافظ!“ وہ عجلت میں کمتی دہاں سے چلی گئی۔

میں الماری کا پٹ کھلا چھوڑ کر کھڑکی کی جانب آیا اور پردہ سرکایا۔ وہ دونوں ہنستے بولتے باتیں کرتے گاڑی کی جانب بڑھ رہے تھے۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ بہت خوش تھے اتنے خوش کہ انہیں میری کمی محسوس نہیں ہوئی تھی۔

میں خاموشی سے بہت خاموشی سے ان کو دیکھتا رہا۔

صبح سو کر اٹھا تو لوگ روم سے ہنسنے اور باتیں کرنے کی زاریں آ رہی تھیں۔ میں ان دونوں آوازوں کو پہچانتا تھا۔
”اگر اس کا کرنل چند دن کے لیے آئی گیا ہے تو مجھے یوں جنسی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے۔ وہ بے چارہ آخر میرا نبیالٹا ہے؟“ میں نے اپنے دل کو صارم کی طرف سے نرم کرنے کی کوشش کی۔ ”مجھے ان کے ساتھ جاکر مہمان رہی بھائی چاہیے۔“ یہی سوچ کر میں اٹھا اور فریش ہو کر باہر چلا آیا۔

رات وہ دونوں دامن کوہ اور شکر پریاں سے خاصے دیر سے لوٹے تھے۔ مومو آئی تو میں سوتا بن گیا اس نے بھی مجھے نہیں جگایا۔ حالانکہ اسے علم ہونا چاہیے تھا کہ میں رات دو تین بجے سے قبل نہیں سوتا تھا سب سے پہلے پہلا نیند ہی تو چراتا ہے۔

میں فضول خیالات کو ذہن سے جھٹک کر لوگ روم میں تو مومو اپنا کینوس اور اریزل سیٹ کر کے کھڑی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں برش تھا جبکہ دوسرے میں پینٹ کی پیٹ۔

صارم اس کے سامنے صوفے پر بیٹھا تھا۔
”کیا ہو رہا ہے؟“ میں نے لہجے کو خوشگوار بناتے ہوئے پوچھا۔

”مومو جو بہت غور سے کینوس کو دیکھ رہی تھی میری بات پر چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔

”صارم کا پورٹریٹ بنا رہی ہوں۔ بات مکمل کر کے وہ پیش سے کینوس پر اسٹوک لگانے لگی۔

”میں جہاں تھا وہیں کھڑا رہ گیا۔ میرے دل و دماغ میں ندھیاں سی جلنے لگی تھیں۔

مومو نے بھی میرا پورٹریٹ نہیں بنایا تھا، کتنی فتن کی فتن میں نے اس کی عمر وہ نہیں بنائی تھی۔ اور اب۔۔۔ وہ صارم کا پورٹریٹ بنا رہی تھی۔ کیا اس کے لیے صارم مجھ سے زیادہ اہم تھا؟

میں کچن کی جانب بڑھ گیا۔ میں آئینہ نہیں دیکھ رہا تھا، مجھے معلوم تھا کہ میرا چہرہ مل بھر میں تاریک پڑ گیا تھا۔

بڑا باندورنی تو پچھوڑا ایک بار پھر سے شروع ہو چکی تھی۔ ”مومو۔ ناشتا!“ میں نے اسے پکارا تو آواز میں خود بخود تڑپ بے زاری سمٹ آئی تھی۔

”میز پر لگا دیا ہے حسان! مومو نہیں صارم!“ اس کی آواز نے کینوس پر تھی۔

واقعی میز پر ہر شے سیٹ تھی۔ میں ناشتا کر کے اٹھا تو کمرے میں استری شدہ کپڑے اور پالشڈ جوتے پہلے سے رکھے تھے۔ میرا ہر کام وہ اب بھی اتنی ہی تندہی سے کرتی تھی جیسے صارم کے آنے سے پہلے کرتی تھی۔ مگر اب اس کی توجہ بٹ چکی تھی۔ اور مجھے اس کا صارم کو اہمیت دینا ایک آنکھ نہیں بھارا تھا۔ مجھے مومو مکمل چاہیے تھی مگر وہ بہت مصروف تھی۔

میں اس سے کوئی بات کہے بنائی چلا گیا۔

”تمہیں یاد ہے صارم! جب میں کینیڈا میں ہوتی تھی تو اکثر سین خاٹہ کے پوچھے بغیر تمہیں باہر لے جاتی اور۔۔۔“

مومو اور صارم پرانی یادیں تازہ کر رہے تھے۔

میں لوگ روم میں رکھے بڑے صوفے پر بیٹھا بظاہر ہنسی دیکھ رہا تھا مگر توجہ ان ہی کی طرف تھا۔

مومو میرے ساتھ والے صوفے پر بیٹھی تھی اور صارم ہمیشہ کی طرح اس کے قدموں کے قریب رکھے کٹن پر بیٹھا بہت توجہ سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ اس کی نظریں مومو کے چہرے پر تھیں اور مسلسل مسکرائے جا رہا تھا۔ اس کی نگاہوں سے مجھے اچھن ہو رہی تھی۔

”نہیں بہت چھوٹا تھا اس وقت اس لیے یاد نہیں مگر مجھے وہ بسکٹ پھر بھی یاد ہیں جو آپ نے بنائے تھے۔“

مومو نے بے اختیار قہقہہ لگایا تھا۔

”مہی اکثر ان بسکٹوں کا قصہ سناتی رہتی ہیں۔“ صارم مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا اور میں اندر ہی اندر سلگ رہا تھا۔

”مہرب! آج پھر وہی بسکٹ بنائیں نا؟ اسی دم صارم نے بچوں کی طرح کہا مومو نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

”چلو بناتے ہیں ویسے میں نے بڑا عرصہ ہوا بسکٹ نہیں بنائے، لیکن چلو اب تمہارے لیے بنالیتے ہیں۔“ وہ کچن میں جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی صارم بھی اس کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔

”مگر آدھا کام تم کرو گے سمجھے؟“ وہ اب مختلف اشیاء نکال کر کاؤنٹر پر رکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔
”ہاں جی میں آپ کا خادم جو کھرا۔ مفت کا خادم۔“ وہ کچھ جل کر بولا۔ مومو نے اختیار نہیں دی۔
کچن میں کچھ پکاتے وقت مومو اکثر دوشہ اتار دیتی تھی

جیسے دو سری خواتین کرتی ہیں۔ ویسے بھی گھر میں صرف ہم دو ہی ہوتے تھے، کوئی مرد ملازم تو تھا نہیں۔

لیکن اس وقت مجھے کرنٹ لگا جب صارم کے ساتھ بسکٹ بناتے ہوئے مومو نے لاپرواہی سے کندھے پر لہراتا دوپٹہ اتار کر سائیڈ پر رکھ دیا اور دونوں آستینیں کھینچیں تک فولڈ کر لیے۔

”آپ اس عمر میں بھی کتنی امارت ہیں مہرا“ صارم بے اختیار کہہ اٹھا تھا اور میں بے یقینی سے اپنی ”حیادار“ بیوی کو دیکھ رہا تھا جو مسکراتے ہوئے تعریف و موصول کر رہی تھی۔

جس مومو کو میں جانتا تھا وہ باہر سرور دہشتہ تو نہیں لیتی تھی، مگر جسم کو اچھی طرح ڈھانپ لیتی تھی۔ کسی دوسرے مرد سے بات کرتے ہوئے اس کے لہجے میں سختی در آتی تھی۔

وہی مومو صارم کے ساتھ ایسے کھڑی تھی؟ ٹھیک ہے کہ وہ اس کا وزن تھا اور چھوٹا تھا مگر اس کو آئی یا باجی نہیں کہتا تھا۔ وہ نامحرم اور جوان تھا کوئی بچہ نہیں تھا۔

میں مومو کو کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ میں اس سے کیا کہتا؟ میری کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

بالآخر میں ریموٹ صوفے پر بیٹھ کر تیزی سے اپنے کمرے میں چلا آیا۔ مومو اپنی مصروف تھی کہ اسے میرے پیچھے آنے کا خیال ہی نہیں آیا۔

☆ ☆ ☆

ان دنوں میں بہت چڑچڑا اور بے زار رہنے لگا تھا۔ ہر وقت میرا دماغ فضول وسوسے بنتا رہتا، میں جتنی کوشش کرنا کہ ان سے بچھا چھڑاؤں وہ اتنے ہی میرے دماغ کو جکڑ لیتے۔ اور کبھی کبھی مجھے وہ فضول نہیں ”درست“ لگتے تھے۔

مومو بدل رہی تھی۔ وہ میری مومو نہیں رہی تھی۔ وہ اب صارم کی مرزبانی جاری تھی۔

صارم سبزی نہیں کھاتا تھا، وہ اب چکن بناتی تھی۔ صارم کو پرفوم بہت اچھے لگتے ہیں وہ جناح سیر سے کتنے ہی ریفو مزاس کے لیے لے آتی تھی۔ صارم کو بلیو اور گرے کھراچھا لگتا ہے، مومو ان رنگوں کی بے تحاشا شرمیں خرید کر اسے گفٹ کر چکی تھی۔ اس کی زبان پر نام ہوتا تو صرف صارم کا اس کو خیال ہوتا صرف صارم کا۔

وہ بن بلایا مہمان اگر ٹھیک سے کچھ نہ کھاتا تو مومو پریشان ہو جاتی۔

”کھا کیوں نہیں رہے؟ ہمیں کچھ اور بنا دوں؟“ اور وہ منع بھی کرتا تب بھی وہ اس کے لیے مچھلی تلنے لگتی۔ مومو کو پراٹھے بنانا بہت برا لگتا تھا اور اب پچھلے تین ہفتے سے وہ روز صبح صارم کے لیے پراٹھے بناتی تھی۔

صارم کا نام لیتے ہوئے اس کی آواز میں بے حد نرمی اور آنکھوں میں ایک پیار بھرا تاثر ہوتا تھا۔ میں اس تاثر کو کوئی نام دینے سے قاصر تھا۔ میرے دماغ میں بار بار خطرے کی گھنٹی بجتی تھی، مگر میں اس کو سننے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔ شاید میں بے غیرت ہو گیا تھا۔

اپنی اسی ذہنی کیفیت کے باعث اس روز ان آٹھ برسوں میں مومو سے میری پہلی لڑائی ہوئی۔

میں نے اس سے رات کو کہا تھا کہ وہ میری سفید شرٹ استری کرے مگر اس نے گرے والی کر دی تھی۔

”یہ کیوں کی ہے؟ میں نے تمہیں بتایا تو تھا!“ بات اتنی بڑی نہیں تھی، مگر میرے اندر اسنے والے لاوے کو راست مل گیا تھا۔

”اوه سوری حسان! وہ میں صارم کی گرے شرٹس لائی تھی نا، تو میرے ذہن میں وہی تھی۔“ وہ ہنس کر اپنی بے وقوفی بتا رہی تھی۔

”میں صارم نہیں ہوں مومو!“ ایک دم میں شرٹ پھینک کر غصے سے بولا تھا۔

اس نے قدرے حیرت سے مجھے دیکھا ”حسان!“

”میں صارم نہیں ہوں، میں تمہارا عام شکل و صورت والا بوڑھا شوہر ہوں۔ تم کیوں بھول جاتی ہو؟“ میری آواز میں زہر بھرا تھا۔

”حسان! میرے ذہن میں نہیں رہا، میں۔۔۔“ وہ ایک دم خاموش ہو گئی۔ ڈانٹ سنے وقت وہ ایسی ہی ہو جاتی تھی۔

”حسان!“ وہ شائد تھی۔ ”آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ وہ بے چارہ چار دن بعد چلا ہی جائے گا، میں خالہ کو کیسے کہہ سکتی ہوں؟“

”میں امید رکھوں گا کہ چار سے پانچ دن نہ ہوں ورنہ بہن سے خودی کہہ دوں گا۔“

اپنی سفید شرٹ اٹھا کر میں واش روم میں گھس گیا۔ یہ امری میرا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے کافی تھا کہ صارم چار دن بعد میرے گھر سے دفع ہو جائے گا۔ مجھے ایک کمینسی سی خوشی ہوئی تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ صبح بہت عجیب تھی۔ میں ایک اچھی نیند لے کر اٹھا تو پتہ نہیں کیوں مجھے فضا میں کسی انہونی کی بو آئی۔ یوں لگتا تھا جیسے ہوا مجھے کوئی پیغام دے رہی ہو۔

دل بھی عجیب سا ہو رہا تھا، طبیعت اور بھی بے زار تھی میں نے ڈرنگ روم سے اپنے کپڑے اٹھائے اور نہانے چاہا۔

یونیورسٹی کے لیے تیار ہو کر نکلا تو یونی آئینے میں ایک نگہ خود پر ڈالی۔

”گندمی رحمت، عام نقوش، کپٹیوں کے سفید بال،“

”تمہوں کے گرد بے تحاشا جھریاں۔ میں مومو کے ساتھ “سوٹ“ نہیں کرتا تھا۔

سر جینٹل کمر میں اپنی کتابوں کی جانب پرہہ گیا تب مجھے یاد آیا کہ رات میرے پین کی بٹ ٹوٹ گئی تھی۔

”ہو سکتا ہے مومو کے پاس کوئی پین بڑا ہو، جس سے میں آج کے دن کام چلا لوں۔“ مگر مومو صارم کے لیے پراٹھے بنا رہی تھی۔ میں اس سے کچھ کہنے کا ارادہ ترک کر کے اس کی الماری کی جانب پرہہ گیا۔

اس کی الماری میں چار خانے کپڑوں کے تھے، پہاڑی، ایک دراز تھی اور سب سے نچلا خانہ جوتوں کا تھا۔ مجھے نہیں علم تھا وہ اپنی چیزیں کدھر رکھتی تھی۔ میں نے اس دراز کھول لی۔ وہاں بے تحاشا برش، پینسنس کے ڈبے، کل پینسنس کی شیشیاں، ”روٹر“، پینسلز اور بہت سے پتھر رکھے تھے۔ میں الٹ پلٹ کر کوئی قلم تلاش کرنے لگا۔

ایک دم میرے ہاتھ کسی شیشی سے ٹکرائے۔ میں نے اسے آکل پینٹ کی شیشی سمجھ کر نظر انداز کرنا چاہا، مگر

دفعتا ”میری نگاہ اس شیشی پر لگے لیبل پر پڑی۔ وہ آکل پینٹ کی شیشی نہیں تھی۔ میں نے اسے اٹھا کر اس کا نام پڑھا۔ اور اس لمحے میں یہ وہی لمحہ تھا جب میری بہت خوشگوار زندگی بربر باد ہو گئی تھی۔

میں نے اس کا نام پڑھا، زمین اور آسمان میری نگاہوں کے سامنے گھومنے لگے تھے۔ مجھے چکر سا آیا، میں نے دیوار کو تھام لیا، اگر نہ تھامتا تو گر جاتا۔

مگر گرتو میں گیا تھا۔ میں آسمان سے زمین پر پڑ گیا تھا۔ وہ شیشی جو میرے ہاتھ میں تھی، جو مجھے اپنی حیادار وفا شعار بیوی کی الماری سے ملی تھی، وہ برتھ کنٹرول نیبلنس کی تھی۔ بہت سے مناظر بہت سی باتیں اور بہت سی سسکیاں مجھے یاد آئی تھیں۔

”میں بانجھ ہوں حسان! میں آپ کو اولاد نہیں دے سکتی۔“ وہ روتے ہوئے کہتی تھی۔

”میں ہاں نہیں بن سکتی!“ وہ کہہ سکتی تھی۔

کسی دوسرے کے بچے کو دیکھ کر روتی تھی، کمرہ بند کر کے پھوٹ پھوٹ کر روتی تھی۔

میں نے آپ کو بتایا تھا، میری بیوی بہت اچھی اداکارہ تھی۔ وہ مجھے پچھلے آٹھ برسوں سے مسلسل بے وقوف بناتی آرہی تھی۔ وہ مجھ سے کہتی تھی، میں بانجھ ہوں اور میں آنکھیں بند کر کے یقین کر لیتا تھا۔ اس نے مجھے کبھی اپنی رپورٹس نہیں دکھائی تھیں، اس نے کبھی کسی قسم کے علاج کی بات نہیں کی تھی۔

اگر آپ کو میری بات پر کوئی جھٹکا لگا ہے تو میں اصل بات آپ کو بتاتا ہوں۔ مومو دراصل کبھی میرے ساتھ رہنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ وہ نفسیاتی مریض تھی۔ ہو سکتا ہے اس کی ہمدردی اور محبت میں آپ اس بات کو بھلا چکے ہوں، مگر میں نہیں بھولا تھا۔

مجھے یاد تھا، مجھے اچھی طرح یاد تھا۔ وہ الیکٹرک کیکس کا شکار تھی اور وہ خود بھی یہ بات جانتی تھی۔ اسے پتا تھا وہ ساری عمر میرے ساتھ نہیں رہ پائے گی۔ بڑھتی عمر اس کے احساسات کو الٹا دے گی۔ میں نے آپ کو بتایا تھا، مومو ایک بہت سمجھ دار لڑکی تھی۔ اسے علم تھا کہ میں چالیس برس کی عمر میں کوئی نوجوان ایسا ہو گا جس کے آگے وہ ہار جائے گی۔ اس سمجھ دار لڑکی نے بہت سمجھ داری سے ساری پلاننگ کی تھی۔ وہ ہاں بن سکتی تھی، مگر وہ ہاں بننا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اولاد کی زندگی پر پاؤں میں نہیں ڈالتا

چاہتی تھی۔ اس کو معلوم تھا، ایک نہ ایک دن وہ مجھے چھوڑنے پر مجبور ہو جائے گی۔ اپنی نفسیاتی جس کی تسکین کے لیے اس نے اپنی مستقر بن کر ڈالی تھی۔ یہ وہ احساس جرم تھا جو اسے سکون سے سونے نہیں دیتا تھا۔ بانجھ عورت میں کمرہ بند کر کے چیخ چیخ کر روایا نہیں کرتیں۔ وہ اکثر نیند میں بڑبڑاتی تھی۔

"I donot wanna dothis"
"some one help me please!"

اس کا احساس جرم اسے کچھ کے لگا تھا کیونکہ بنیادی طور پر وہ ایک مخلص لڑکی تھی، مگر اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لیے وہ بہت آگے نکل چکی تھی۔ کتنی ہی دیر شیشی ہاتھ میں تھا ہے میں اسے دیکھتا رہا۔ میرے دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں۔

چونیس برس میں نے اس عورت سے محبت کی۔ چونیس برس میں سمجھتا رہا کہ میری ماں مجھے چھوڑ سکتی ہے، منگیتر نامعہ بے وفائی کر سکتی ہے، مگر مومو کبھی ایسا نہیں کرے گی۔

اگر مجھ میں غیرت اور عقل ہوتی تو پچھلے تین چار ہفتوں سے جو میرے گھر میں ہو رہا تھا وہ مجھے جھنجھوڑنے کے لیے کافی تھا۔ مومو کا صارم کے لیے التفات میری نگاہوں سے چھپا نہ تھا۔ مگر پھر بھی میں خود کو کوس کر اپنی شکی طبیعت کو مورد الزام ٹھہرا کر خاموش ہو جاتا تھا۔

مگر وہ شیشی۔ اس نے مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا تھا۔

بست دیر میں دیوار کے سہارے ٹیک لگائے، ماؤف ہوتے دماغ کے ساتھ کھڑا رہا، پھر جیسے کچھ ہوش آیا تو میں نے انگلیوں میں جکڑی مانع حمل گولیوں کی شیشی حبیب میں ڈال لی۔

بست تھکے تھکے قدموں سے چلتے ہوئے میں باہر آیا تھا۔ مومو اور صارم کسی بات پر ہنس رہے تھے۔ میں نے ان کو نہیں دیکھا، میں نے کسی کو نہیں دیکھا، میں صرف زمین کو دیکھ رہا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے میں گمن تھے وہ جوان تھے، زندگی ان کے لیے ہستی مسکراتی تھی، اور میں بوڑھا، بے وقوف، مرد دھیرے دھیرے چلتا ہوا باہر آیا۔

میں یونیورسٹی نہیں جا رہا تھا مجھے خود نہیں علم تھا میں کہاں جا رہا ہوں، تمام راستے انجانے لگ رہے تھے۔ جن راستوں کا میں راہی تھا انہوں نے مجھے کہاں پہنچا ڈالا تھا۔

تا نہیں کب اور کیسے میں چلتا ہوا پارک آ پہنچا۔ یہ روش پتھر کی روش تھی جہاں میں چودہ برس کی اس لڑکی کے ساتھ جاٹنگ کیا کرتا تھا۔ وہ لڑکی کدھر چلی گئی؟ میں اسے کہاں ڈھونڈوں؟

میں ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ میرا سب کچھ تو لٹ چکا تھا۔ میری واحد متاع "ٹیک بیوی" تھی، جواب کہیں بھی نہیں تھی۔ میں، چھپن سالہ بی بی ایچ ڈی ڈاکٹر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رہا چاہتا تھا، مگر مومو نے تو مجھ سے آنسو بھی چھین لیے تھے۔ میں نے اس کو کئی برس پہلے "آئی بیٹ یو" کہا تھا، وہ اس دن بہت روئی تھی، اور پھر اس نے بہت اچھا انتقام لیا تھا۔

"رضوی صاحب کی بیوی کا پتا ہے، تم لوگوں کو؟" میری سماعت سے ایک معمر آواز نکل گئی۔

جس درخت کے ساتھ میں کھڑا تھا، اس کے چھپے بیچ ہمارے کالونی کے چند معمر رشتہ باز بوڑھے روز کی طرح گپ شپ کے لیے جمع تھے۔ میں درخت کی اوٹ میں تھا، ان کی دلی بھی میری جانب پشت تھی، وہ۔۔۔ میری موجودگی سے لاعلم، سی فائبر والے رضوی صاحب کو ڈسکس کر رہے تھے میری ذہنی کیفیت مجھے ان کی کوئی بات نہ سننے دیتی، اگر میں عارف صاحب کا اگلا فقرو نہ سنتا۔

"ہاں بھئی، رضوی صاحب نے گھر سے نکال دیا ہے۔ جن دنوں وہ فیکٹری کے کام سے فیصل آباد گئے تھے، ان کی بیوی ان کے دوست کے گھر آتی جاتی تھی۔ ان کے ڈرائیور نے رضوی صاحب کے آتے ہی بتا دیا۔ اب بتاؤ، گھنوارے اکیلے رہنے والے مرد کے گھر میں بھلا اس عورت کا کیا کام؟"

"ہاں بھئی، دنیا بڑی فریبی ہے۔ شکلیں جتنی معصوم ہوتی ہیں، کثرت اتنے ہی گھٹاؤنے۔ اب یہ ڈاکٹر صاحب کی جوان بیوی کو ہی دیکھ لو،" صبح صاحب کہہ رہے تھے اور مجھے لگا، میں اگلا سانس نہیں لے سکوں گا۔

"کون ڈاکٹر صاحب؟" عارف صاحب کو یاد نہیں تھا۔ "سی فائبر والے ڈاکٹر حسان، جنہوں نے اس عمر میں جوان لڑکی سے شادی کی تھی۔ بھئی، ہم نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا، ایسی غیر حقیقی اور غیر فطری شادیاں نہیں چلا کر تیں۔ بوڑھا مرد، جوان عورت کو نہیں سنبھال سکتا۔" مجھے لگ رہا تھا، کوئی مجھے چوک پر کھڑا کر کے کوڑے،

"کیا ہوا حسان صاحب کی بیوی کو؟ وہ تو بڑی اچھی ہے، نہ رے بھائی، جب بیمار ہوئی تھیں، تو روز سوپ بنا کر بھیجا کرتی تھی۔"

"ارے یہ۔ ایسی ہی ہوتی ہیں۔ سوپ بنا کر، معصوم زائیں دکھا کر اپنے جال میں پھنسانے والی دیکھتے نہیں ہو، کیسے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اس ولایت والے کزن کے ساتھ ادھر پھر رہی ہوتی ہے؟ ہم آنکھیں رکتے ہیں میاں، کوئی بچے نہیں ہیں۔"

صبح صاحب کے الفاظ مجھے چھلنی کر رہے تھے، میرا دماغ زخمی ہو چکا تھا۔

"صحیح کہتے ہو صبح! محبت بے غیرت اور بے وقوف بنا دیتی ہے۔"

یہ انتہا تھی، میں اس سے آگے نہیں سن سکتا تھا۔ میں بے وقوف تھا، میں بوڑھا تھا، مگر میں بے غیرت نہیں تھا۔

جس کو میں مفروضہ سمجھتا تھا، وہ چوک میں بیٹھے لوگوں کے لیے گوسپ بن چکا تھا۔

میرے اندر کا مرد جاگ اٹھا تھا۔ میں بغیر کوئی آہش پیدا کیے ذرا خوں کے جھنڈے نکلا، اور ان دونوں کے پیچھے سے تیز قدم اٹھا، پارک سے نکل گیا۔

میرا رخ گھر کی جانب تھا۔ مجھے مومو سے بات کرنا تھی، مجھے اس سے صرف دو ٹوک بات کرنا تھی۔ میں مومو کو بخوڑنا نہیں چاہتا تھا، میں اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں اس کو معاف کرنے کے لیے تیار تھا۔ میں بوڑھا ہو چکا تھا، مجھے اس کی ضرورت تھی اسی قسم کے خیالات

میں نے اپنے اندر کے غیرت مند مرد کو اندر ہی دفن کرنے کی کوشش کی، آپ مجھے بے غیرت کہیں، بھئی، آپ کہہ سکتے ہیں۔

بہت آہستگی سے میں نے گھر کا بیرونی دروازہ کھولا۔ بے نرم اٹھا تا میں اندر داخل ہوا، مومو اور صارم، میری آمد سے بے خبر تھے۔ ان کے خیال میں، میں یونیورسٹی جا چکا تھا۔

میں آگے بڑھتا چاہتا تھا، مگر لونگ روم کا منظر دیکھ کر مجھے سانس ہونا پڑا۔

میں نے پر صارم بیٹھا تھا۔ اس کے بہت قریب مومو بیٹھی تھی، اس کا سر صارم کے کندھے پر تھا، اور آنکھوں

میں آنسو تھے۔ صارم کا دایاں بازو مومو کے شانوں کے گرد تھا۔

کبھی ان آنسوؤں سے میں بھی بارگیا تھا، اور حیدر بھی۔ "میں تمہیں بہت مس کروں گی، صارم!" وہ بھیگی آواز میں کہہ رہی تھی۔

"مہرا، آپ میری بات کیوں نہیں مان لیتیں؟ آپ میرے ساتھ کینیڈا آجائیں۔ میں وہاں جلد ہی الگ اپارٹمنٹ لے لوں گا، بس پھر میں ہوں گا، اور آپ۔ ہم ہمیشہ اکٹھے رہیں گے۔"

"کبھی کبھی میرا دل کرتا ہے میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر واقعی تمہارے ساتھ چلی جاؤں۔ مگر حسان۔۔۔ وہ متذبذب تھی۔"

"آپ ان کو ایک دفعہ بتا دیں، دو ٹوک انداز میں بتا دیں۔" وہ جیسے چڑ کر بولا تھا۔

"کیا بتاؤں؟" "کیا کہ آپ ان جیسے خود غرض اور سیلف سینٹرڈ بندے کے ساتھ نہیں بلکہ میرے ساتھ رہنا چاہتی ہیں۔"

"صارم! ایسے مت کہو، میں ان سے بہت محبت کرتی ہوں۔" میرے دل میں خوش گمانیوں نے سر اٹھایا تھا۔ "ٹھیک ہے، پھر میرے بغیر رہ لیں گی آپ؟" وہ جیسے تھا سا ہو گیا تھا۔

"نہیں رہ سکتی ہوں، یہ تو مسئلہ ہے۔ تمہارے بغیر بھی نہیں رہ سکتی۔ میں تو تمہیں دیکھ کر جیتی ہوں صارم! میں نے زندگی میں سب سے زیادہ محبت ہی تم سے کی ہے۔" میری خوش فہمیوں کا گھڑا پھٹنا چور ہو گیا تھا۔

"حسان صاحب سے بھی زیادہ؟" "آپ کو رس صارم! کیا تمہیں شک ہے؟" اس نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

زندگی میں پہلی دفعہ مجھے مومو سے کثرت محسوس ہوئی تھی۔ پہلی دفعہ میرا دل اس پر تھوکنے کو چاہتا تھا۔ میں اوٹ سے نکلا۔ وہ دونوں میرے سامنے تھے، مگر انہوں نے مجھے نہیں دیکھا۔

"آئی لو پوٹو، مہرا!" صارم اس پر جھکا تھا، مومو نے آنکھیں موند لیں، اس نے مومو کے ماتھے پر اپنے لب رکھ لیے۔

"میں نے بھی اس دنیا میں سب سے زیادہ آپ سے

محبت کی ہے۔ میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ اس پر جھکا نہایت جذب کے عالم میں کہہ رہا تھا۔

”تو پھر لے جاؤ اپنی مرکو۔“ ان دونوں کے بالکل سامنے آکر میں بلند آواز میں بولا تھا۔

کرنٹ کھاکر مومو اس سے علیحدہ ہوئی۔

”حسان آپ! وہ کھڑی ہو گئی“ اس کے چہرے کا رنگ اڑچکا تھا۔ میں نے گہری نگاہوں سے اسے دیکھا۔

اس نے بے اختیار کندھے پر آیا دھنڈا درست کیا پھر قدرے گھبرا کر چہرے پر بکھرے بال سمیٹنے لگی۔ اس کی انگلیاں کپکپا رہی تھیں۔

”تم اس کے بغیر نہیں رہ سکتیں، پھر چلی کیوں نہیں جاتیں؟“ میں ایک قدم آگے بڑھا تھا۔

اس نے نگاہیں اٹھا کر مجھے دیکھا، پھر جیسے جبراً مسکرائی۔

”آپ کب آئے؟ یونیورسٹی نہیں گئے سینچ۔ جلدی آگئے ہیں نا؟“

”نہیں مومو! مجھے تو بہت دیر ہو گئی ہے اس مقام تک آتے آتے!“ میرا لہجہ سرد تھا۔

اس نے خوف زدہ ہو کر میرا چہرہ دیکھا، ”لگ۔ کیا ہوا حسان؟“

میں نے ایک زوردار تھپڑ اس کے چہرے پر مارا۔ وہ لڑکھرائی۔

”چونتیس برس، مومو، چونتیس برس میں نے تم سے محبت کی اور تمہیں تم کھٹا عورت۔“ میں نے ایک اور زوردار تھپڑ مارا تو وہ چکر اکر گر گئی، میں نے اسے اپنے پاؤں میں موجود جوتوں سے بھی ٹھوک ماری۔

”ذلیل۔ بد کردار۔ حرافہ۔“ میں اسے گالیاں بک رہا تھا۔ وہ صوفے پر گری، چپ چاپ پٹ رہی تھی۔

پھر ایک دم میں نے اپنا ہاتھ روک لیا، اس کے منہ سے خون نکل رہا تھا، اس کا کیچر نوٹ چکا تھا، مگر مجھے مومو پر ترس نہیں آیا تھا۔

صارم ششدر کھڑا سارا تماشا دیکھ رہا تھا۔ ”حسان! مجھے معاف کر دیں۔“ صوفے پر بیٹھی مومو میرے قدموں میں آگئی، ”میں آپ سے بہت محبت کرتی ہوں۔“ مجھ سے غلطی ہو گئی تھی میں۔

وہ رو رہی تھی، میں نے اپنے بھاری بوٹ سے اس کے چہرے پر ٹھوک ماری، وہ پیچھے کو گر گئی۔

”غلطی؟ تم اسے غلطی کہتی ہو؟ تم سمجھتی رہیں یہ

بوڑھا ہو گیا ہے تو شاید بے غیرت بھی ہو گیا ہے، مگر میں بے غیرت نہیں ہوں۔“

”بس کریں حسان صاحب! چھوڑیں مرکو۔“ میں اسے مارنے کو آگے بڑھا تو صارم نے بے اختیار مدخلت کی۔

”شٹ آپ صارم۔ تم جاؤ یہاں سے۔“ مومو نے ایک دم چیخ کر اسے روکا۔ اس کے بڑھتے قدم دیں رک گئے۔

وہ اب صوفے کا سہارا لے کر اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی، میں نے اس کا بازو کھینچ کر اسے اٹھایا اور اس کا چہرہ اپنے بالکل سامنے کیا۔

”اٹھ سال تم مجھے دھوکا دیتی رہیں، کیوں؟ مجھے جواب دیا، ”میں چیخ رہا تھا، اس نے ہونٹوں سے رستا خون بہا، پست سے صاف کیا اور کچھ کہنے کو لب کھولے۔

”مم۔ مم۔ میں۔۔۔“ وہ کچھ کہنے ہی لگی تھی کہ میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر دوائی کی وہ شیشی نکال کر اس کے سامنے کی۔

”یہ کیا ہے، مہر اتنا؟“

وہ جو کچھ کہنا چاہ رہی تھی، جیسے دو سو والٹ کا کرنٹ کھاکر دو قدم پیچھے ہٹی۔

اس کی آنکھوں میں بے یقینی تھی، اس کا پورا وجود یکا لمحے کو لرزاتا تھا۔

”یہ تم استعمال کرتی ہو نا، مومو؟“ میں شیشی اس کے چہرے کے قریب لے جا کر پوچھ رہا تھا۔

وہ اسی طرح پچھلی پچھلی نگاہوں سے شیشی کو دیکھتی رہی۔

”مجھے جواب دو؟“ میں حلق کے بل دھاڑا تھا۔

کچھ کہنے کے لیے کھلے لب اس نے بند کر کے زور سے آنکھیں میچ لیں، پھر انہیں کھول کر میری جانب دیکھا۔

اس لمحے میرے ذہن میں خیال آیا تھا کہ شاید وہ شیشی کسی اور کی ہو، مومو ڈاکٹر بھی، اس نے کسی کو دینی ہوگی، شاید میں بالکل غلط ہوں۔ کاش ایسا ہو جائے، کاش مومو کہہ دے کہ یہ کسی اور کی ہے۔

”مجھے ٹھیک ٹھیک بتاؤ، مومو! یہ تم استعمال کرتی ہو؟“

اس نے بہت بے بسی سے میری جانب دیکھا اور پھر مومو نے، میری مومو نے اثبات میں سر ہلادیا۔

میں نے زور سے شیشی دیوار پر دے ماری۔ میرا ہ کچھ جل کر ختم ہو چکا تھا۔

”چلی جاؤ تم یہاں سے۔ دفع ہو جاؤ میرے گھر سے۔“

میں نے اس کو بازو سے پکڑا اور گھسیٹا ہوا دروازے تک لے آیا۔ اس کے ہونٹوں کے کنارے سے خون رس رہا تھا چہرہ متورم اور آنکھیں سوچی ہوئی تھیں، وہ چپ خمی بالکل چپ۔

”میں نے تم سے محبت کی بے پناہ محبت مگر تم بد کردار عورت، تم نفسیاتی مریض۔ تم نے میرا مان توڑ دیا مومو! نکل جاؤ میرے گھر سے، دفع ہو جاؤ میری نظروں کے سامنے سے۔“ میں نے بیرونی دروازہ کھول کر اسے باہر دھکا دینا چاہا۔

”نہیں۔“ وہ ایک دم چیخ پڑی تھی۔ ”یہ میرا گھر ہے، میں نہیں جاؤں گی۔“ اس کی آنکھوں سے آنسو نکل رہے تھے، اس نے اپنی انگلیوں سے دروازے کی چوکھٹ تھام لی۔

”یہ تمہارا گھر نہیں ہے۔“ میں وحشیانہ انداز میں اسے باہر دھکیل رہا تھا، وہ میرے تھپڑوں کی تاب نہ لاتے ہوئے دیں زمین پر بیٹھتی چلی گئی، دروازے کا کنارہ ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔

”میں آپ کی بیوی ہوں، مجھے ایک دفعہ۔“ وہ روتے ہوئے کچھ کہنا چاہ رہی تھی۔

”شٹ آپ۔“ میں نے اسے اپنے بوٹ کی ایک اور ٹھوک ماری، ”میرا اب تم سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔“

میں نے زور سے دروازہ بند کرنا چاہا۔ اس کی انگلیاں درمیان میں آکر چکی گئیں، ان سے خون نکل کر وہیں جو کھٹ پر گر رہا تھا۔

میں نے دروازہ کھول کر اس کے خون آلود ہاتھ دہاں سے ہٹانے چاہے۔ وہ دروازے کو پکڑے بیٹھی تھی جبکہ میں اسے دھکیل رہا تھا، اس کی پنک گھڑی اسی کشمکش میں پھنسا کر گئی۔

”اس گھر سے اب تمہارا کوئی تعلق نہیں۔ دفع ہو جاؤ تم یہاں سے۔“ اس کے ہاتھ چھڑانے کی کوشش میں میرے اپنے ہاتھ خون آلود ہو چکے تھے۔

”نہیں۔ آپ ایسے نہیں کر سکتے۔ چونتیس برس کا غلطیوں ختم نہیں کر سکتے۔ حسان! آپ۔ نہیں۔“ وہ دروازہ پکڑ کر رونے لگی تھی۔

”یہ خیال تمہیں اس وقت نہیں آیا جب تم میرے گھر کی میری ٹاک کے نیچے، اپنے کزن سے ایئر چلا رہی تھیں؟ جب میری غیر موجودگی میں تم مجھ سے بے وفائی کر رہی

تھیں؟ تب تمہیں اس چونتیس برس کے تعلق کا خیال نہیں آیا؟“ میں بھڑک اٹھا تھا۔

ایک دم مومو نے دروازے کی دہلیز چھوڑ دی، وہ صرف اور صرف مجھے دیکھ رہی تھی، اس کی نگاہیں جیسے پتھر کی ہو گئی تھیں۔ وہ بالکل ساکت ہو چکی تھی۔

”کیا کہا آپ نے؟“ اس نے بے یقینی سے پوچھا تھا۔

”تم کیا سمجھتی تھیں، مجھے پتا نہیں چلے گا؟ تم میرے گھر میں ایک غیر مود کے ساتھ ایئر چلاتی رہو گی، اور میں میں بڑھا اور بے غیرت بن کے تماشا دیکھا رہوں گا؟ تم جھوٹی بد کردار، ذلیل عورت۔“ بولتے بولتے میرا سانس پھول گیا تھا۔

اسی لمحے مومو زمین سے اٹھ کھڑی ہوئی، اس کی انگلیوں سے خون رس رہا تھا، مگر اس کو درد نہیں ہو رہا تھا۔ وہ مجھے دیکھ رہی تھی، میری آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔

”میں جھوٹی ہوں؟ میں بد کردار ہوں؟ ہاں میں جھوٹی اور بد کردار ہوں، میں آپ کے گھر میں اپنے کزن کے ساتھ ایئر چلاتی رہی ہوں۔ ہاں میں بہت بری ہوں۔ ایک دفعہ آپ نے کہا تھا، تم نادان ہو۔ پایا نے بھی یہی کہا تھا، آپ دونوں نے درست کہا تھا۔ ہاں میں نادان تھی، یا گل تھی، بے وقوف تھی، جو چونتیس برس آپ سے محبت کرتی رہی۔“

وہ مجھے دیکھتے ہوئے پیچھے ہٹی، صارم تو پہلے ہی باہر جا چکا تھا۔

”میں۔۔۔“ اس سے آگے بولنے کی ہمت مومو میں نہیں رہی۔ وہ کب لڑائی جھگڑوں میں بولا کرتی تھی لب بھیج کر وہ اپنے خون آلود ہاتھ لیے بھاگتی ہوئی صارم کے پاس چلی گئی، میں نے دروازہ بند کر دیا۔

میاں بیوی کے درمیان اصل رشتہ اعتبار اور اعتماد کا ہی تو ہوتا ہے۔ ہمارے درمیان وہ دونوں ختم ہو چکے تھے۔

میری مومو اپنی بد کرداری، اپنے جھوٹ کا اقرار کر کے میرے گھر سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جا چکی تھی۔

مومو ایک دفعہ پھر میری زندگی سے چلی گئی تو میں زندگی کو آٹھ برس پہلے کی اسٹیج پر لے آیا۔ فرق صرف یہی تھا کہ اب مجھے مومو کا انتظار نہیں تھا۔ اسی لیے میں نے آرٹ اکیڈمی بند کر دی اور اپنا خراج صرف یونیورسٹی سے چلانے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیش کش

(WWW.PAKSOCIETY.COM)

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے آپ کیلئے پیش کیا۔

ہم خاص کیوں ہیں؟؟؟؟

یہ واحد ویب سائٹ ہے جہاں سے تمام مہتممہ ڈائجسٹ، ناول، عمران سیریز، شاعری کی کتابیں، بچوں کی کہانیاں، اور اسلامی کتابیں

ڈائریکٹ ڈاؤن لوڈ کرنے کے ساتھ ساتھ آن لائن پڑھ بھی سکتے ہیں۔



fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف

اگر آپ کو ویب سائٹ پسند آئی ہے تو پوسٹ کے آخر میں اپنا تبصرہ ضرور دیں۔

اپنا تبصرہ صرف پوسٹ تک محدود رکھیں۔ درخواست کے لئے رابطہ کا صفحہ استعمال کریں۔

اپنے دوست احباب کو بھی پاک سوسائٹی کے بارے میں بتائیں۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی انتظامیہ سے مالی تعاون کیجئے۔ تاکہ یہ منفرد ویب

سائٹ آپ کیلئے جاری رکھی جاسکے۔

پاکستانیوں کے ویب سائٹ

WWW.Paksociety.Com



Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

نور منوں کے مال پر آیا ہوں۔

مال کے ایک قدرے منگے سے اسٹور سے کچھ شاپنگ کرنے کے لیے میں وہاں گیا تھا۔ پتا نہیں کیوں، نور منوں کی سڑکوں میں پھرتے ہوئے مجھے لگتا تھا کہ میں سرراہ مومو سے ٹکرا جاؤں گا۔ وہ رہتی بھی ڈاؤن ٹاؤن کے قریب ہی تھی۔ اگر اس نے الگ گھر لے لیا ہو تو الگ بات تھی مگر یہیں کا گھر یہیں آس پاس ہی ہوتا تھا اور مجھے یقین تھا کہ مومو صدمہ کے ساتھ چلی آئی تھی۔

ایک گارمنٹس شاپ سے لیدر جیکٹ پسند کرتے ہوئے، میں مسلسل اطراف میں دیکھ رہا تھا، مگر وہاں مومو کہیں نہیں تھی۔ بالآخر میں اپنی جیکٹ کی جانب متوجہ ہو گیا۔

جس لمحے میں کاؤنٹر پر کھڑا بے منت کر رہا تھا، مجھے اپنے دائیں جانب ایک شناسا چہرہ دکھائی دیا۔

وہ مومو نہیں تھی، وہ صادم تھا۔

وہ بھی اپنے لیے جیکٹ پسند کر رہا تھا۔ وہ پہلے سے زیادہ بڑا اور ہینڈ سم ہو گیا تھا۔ اس نے چھوٹی سی واٹر می بطور فیشن رکھی ہوئی تھی۔ اس کا قد اور بھی لمبا بھی ہو گیا تھا۔ کتنے ہی لمحے میں صادم کو دیکھتا رہا، وہ چیونچم چبانے ہوئے جیکٹ کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ اس کے ساتھ ایک لڑکی بھی ہے۔ اور وہ لڑکی مومو نہیں تھی۔

وہ شکل سے ایشین لگتی تھی مگر شاید پلی بڑھی وہیں تھی۔ مجھے بہرحال صادم کو کسی اور لڑکی کے ساتھ دیکھ کر جھٹکا لگا تھا۔

جیکٹ کی بے منت کر کے صادم اپنا شارٹ تھامے کسی بات پر ہنستے ہوئے اس لڑکی کے ہمراہ باہر نکلنے لگا تھا کہ دفعتاً اس کی نگاہ مجھ پر پڑی۔

اس کی ہنسی رک گئی، صرف ایک لمحہ لگا تھا اسے مجھے پہچاننے میں، پھر اس نے منہ پھیر لیا۔

”صادم!“ اپنی انا، عزت نفس کو پس پشت ڈال کر میں نے اسے پکارا تھا۔

اس نے چہرہ میری جانب کیا۔ اس کے چہرے پر عجیب سا تڑپ آ گیا تھا۔

”ہاں۔“ اس نے یوں مخاطب کیا جیسے ہم اجنبی ہوں۔ میں ایک قدم آگے بڑھا۔ ”مجھے تم سے بات کرنا

لگا۔ وہ گئی تو میرا گھر ایک دفعہ پھر دربار ہو گیا۔ میری ہر شے بے ترتیب ہو گئی، کوئی چیز بھی نہیں ملتی تھی۔ میں نے بالآخر ایک لڑکے کو ملازم رکھ لیا۔

اس ملازم لڑکے نیل کو میں نے کہہ رکھا تھا کہ وہ مجھے ناشتے میں تلا ہوا انڈا اور کافی نہیں دے گا، نہ ہی وہ لونگ روم میں ان ڈور پلائس رکھے گا۔ مومو کے تمام پودے میں نے اپنے گھر سے باہر نکال دیے تھے۔

جس صبح وہ میرے گھر سے گئی تھی، اسی شام میں نے اس کا تمام سامان، کپڑے، جوتے، پاسپورٹ وغیرہ بیک میں ڈال کر حیدر کے گھر پہنچا دیا تھا۔ یہ کام میں نے خود نہیں کیا تھا، بلکہ ایک ملازم کی مدد لی تھی۔

ہر روز صفائی کرتے وقت نیل دروازے کی چوکھٹ پر لگے سیاسی مائل سرخ دھبوں کو صاف کرنے کی ناکام کوشش کرتا تھا۔ وہ دھبے صاف نہیں ہوتے تھے۔ مومو اپنی یادیں میرے گھر میں بکھیر کر چلی گئی تھی۔

تو یہ بھی میری کہانی۔ ایک بے وفاماں سے شروع ہو کر بے وفائی پر ختم ہونے والی داستان۔

میں نے آپ سے کہا تھا، میں آپ کو کوئی افسانوی قسم کی happy ending (خوشگوار اختتام) نہیں دے پاؤں گا، آپ کو چند کڑے حقائق اپنے حلق سے نیچے اتارنے پڑیں گے۔

تو یہ میری کہانی کا اختتام تھا۔ اگر میں کوئی رائٹر ہوتا تو اپنی اور مومو کی کہانی میں ختم کر ڈالتا کیونکہ رائٹر کے پوائنٹ آف ویو سے آگے کچھ بچانا تھا۔

لیکن۔

میری داستان ابھی ختم نہیں ہوئی۔ ابھی کچھ باقی ہے، وہ ”کچھ“ جس کے لیے میں آپ کو یہ کہانی سناتا تھا۔

مومو کے جانے کے چار، ساڑھے چار برس بعد، یعنی کل شام میں کینڈا آیا ہوں۔

مجھے یہاں ایک دنیائے آرٹ کے سینما میں شرکت کرنا تھی، ایک جگہ، پیکر دہنا تھا، اور بس میری کل صبح واپسی ہے۔

کل کی پوری شام سینما میں گزر گئی، آج کی صبح یونیورسٹی میں، اور بالآخر میں نبی محمدؐ پہلے فاسخ ہو کر

دنیا بھر سے منتخب معیاری ادب

مران ڈائجسٹ

اگست 2008 کا شمارہ شائع ہو گیا ہے

Email: id@khawateendigest.com

☆ "آتش زاہد" ایک نوجوان کی حیرت انگیز داستان جو غمی ہی عمر میں ہی دشمنوں کا نشانہ بن گیا تھا۔ پرتشخص سلسلہ،

☆ "امد میری مسافتیں" معاشرتی برائیوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے والے ایک نوجوان کی مٹا مٹا خیر داستان، ہم اے راحت کے قلم سے،

☆ "آشیانہ" آخری صفحات پر ایم اے راحت کی معاشرتی تحریر،

☆ "شیطان کے گماشتے" اسلم راہی کے قلم سے تاریخ کے اوراق،

☆ ملکی و غیر ملکی ادب سے انتخاب،

☆ زندگی کے تلخ حقائق سے منتخب "بچی داستانیں"۔

ادب کے وہ بہترین ڈائجسٹ

تازہ شمارہ آج ہی خرید لیں

تجربہ صرف آپ! آپ نے ان کو دھتکارا تھا۔ نتیجتاً انہوں نے صرف آپ کو دکھ دینے کے لیے کینیڈا جاتے ہی بین آنٹی کے دیور سے شادی کر لی تھی۔ وہ چاہتی تھیں کہ اپنے شوہر کے ساتھ وطن واپس آئیں اور آپ کو یہ سب کچھ بتا کر دکھ دیں۔ مگر ان کی شادی دو ماہ ہی چل سکی تھی۔ بین آنٹی کے دیور یعنی میرے فارر کا وہ ماہ بعد ہی ایک سبڈنٹ میں انتقال ہو گیا تھا۔

جب سترہ سال کی عمر میں مہراں میں تو انہیں لگا انہوں نے غلطی کر ڈالی ہے۔ وہ مجھے بین آنٹی کے حوالے کر کے پاکستان چلی گئیں۔ ان کے دل میں کہیں نہ کہیں یہ امید باقی تھی کہ آپ ایک نہ ایک دن ان کی محبت کا یقین کر کے ان سے شادی کر لیں گے، یہی امید اور یہی خواہش تھی جس نے ان سے جھوٹ بلوایا۔ یہاں کسی کو ان کی شادی کا علم نہیں تھا۔ بین آنٹی نے سب سے چھپا لیا تھا۔ وہ چاہتی تھیں مہر کی شادی ہو جائے اس لیے یہ بات مشرقی پوائنٹ آف دیور سے چھپانا ضروری تھی کہ وہ ایک بیوہ اور ایک بچے کی ماں بھی ہیں اور آپ سے چھپانا تو اور بھی ضروری تھا۔ وہ کہتی تھیں۔

"میں نے حسان سے اس لیے چھپایا کہ وہ شخص تو باسی کھانا نہیں کھاتا تھا، کسی دوسرے کے استعمال شدہ تو لیے کو ہاتھ نہیں لگاتا تھا، وہ بھلا کسی کی بیوہ کو کہاں قبول کرے گا؟"

میرے نزدیک یہ ان کی غلطی تھی۔ لیکن غلطی انسانوں سے ہی ہوتی ہے۔ وہ کوئی ریفریکٹ قسم کا انسانی کردار نہیں تھیں، وہ ایک جیتی جاگتی انسان تھیں۔ ان سے بھی حماقت ہوئی تھی اور اس حماقت کا ثبوت میں تھا۔

سترہ برس میں کینیڈا میں بین آنٹی کے پاس بلا بڑھا، سترہ برس میں ماں کی محبت کو ترسا۔ میری ماں اپنا گھر بنانے کے لیے مجھے چھوڑ گئی تھی، بائیکل ایسے جیسے آپ کی ماں آپ کو چھوڑ گئی تھی۔ مگر میں نے حسان رضا کی طرح اپنی ماں کو بے وفا نہیں قرار دیا، میں ان کی مجبوری کو سمجھتا تھا۔ انہوں نے آپ سے ایک جھوٹ بولا اور اسے چھپانے کے لیے اور بھی کتنے جھوٹ بولے۔

وہ بہت سچے اور حساس دل کی مالک تھیں، انہوں نے اپنے بچے کو اس کا حق نہیں دیا تھا۔ وہ محبت نہیں دی تھی جس کا وہ حق دار تھا اس لیے ان کے دل میں احساسِ جرم تھا۔ وہ جب بھی کسی بچے کو دیکھتی تھیں۔ یہ احساسِ جرم انہیں ہر ایک طرح ڈنڈا بناتا تھا۔ پھر وہ سراسیمہ کیسے پیدا

"حسان صاحب! آپ نے میرے "صرف" محبت کی تھی اور محبت "صرف" نہیں ہوا کرتی محبت اعتبار اور اعتماد کے بنا دھوری ہوتی ہے۔ آپ نے جو تیس برس میرے محبت کی، مگر اعتبار نہیں کیا بلکہ آپ نے تو شاید ان سے محبت بھی نہیں کی، آپ کو صرف ان کی ضرورت تھی۔ محبت تو صرف آپ نے اپنے آپ سے کی ہے۔ آپ ایک خود غرض، سیلف سینٹرڈ اور خود پسند انسان ہیں۔ آپ کو ہمیشہ سے اپنا مفاد عزیز رہا ہے۔ اور مہر صاحب! آپ جو تیس برس اس عورت کو نہ سمجھ سکے؟ آپ جانتے ہیں مہر کون تھیں؟ آپ نہیں جانتے، آپ تو کچھ بھی نہیں جانتے۔ میں آپ کو بتاتا ہوں۔"

اس کی آنکھوں میں سرفی تھی، کرب تھا۔ اس کی آواز سے میرے لیے نفرت چھلک رہی تھی۔

"میں آپ کو بتاتا ہوں حسان صاحب! مہر کون تھیں وہ عورت جسے آپ نے بے عزت کر کے دھکے دے کر مجھ سے افسیر چلانے کے الزام میں گھر سے نکالا تھا وہ عورت حسان صاحب۔ وہ عورت میری ماں تھی۔ میری سگی ماں!"

مجھ پر کسی نے آسمان توڑا تھا، میں جیسے کرنٹ کھا کر دو قدم پیچھے ہٹا۔ "نہیں... نہیں..." میں نے بے یقینی سے نفی میں سر ہلایا۔ وہ غلط کہہ رہا تھا، مومو کیسے اس کی ماں نہیں...

"یقین نہیں آیا نا آپ کو؟ کیسے یقین آسکتا ہے آپ کو؟ آپ تو اپنے شک میں بہت دور تک نکل چکے ہیں۔ آپ تو میرے اور ان کے تعلق کو ہماری محبت کو اس گندی نظر سے دیکھتے رہے جس کے بارے میں مجھے سوچتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔"

مجھے لگا صارم رو رہا ہے۔ اس کی آواز بھیگ چکی تھی۔

"میری ماں نے زندگی میں صرف ایک غلطی کی تھی، میرے نزدیک یہ غلطی نہیں تھی مگر ان کے نزدیک تھی۔ جس دن آپ نے ان کو رلایا تھا ان کی عزت نفس کو کچا تھا اس دن انہوں نے روتے ہوئے اپنے پیپا سے کہا تھا کہ اگر حسان نے مجھ سے شادی نہ کی تو میں اپنی مرضی سے کسی سے بھی شادی کر کے خود کو برباد کر ڈالوں گی، شاید تب "سر" کو دکھ ہوا اور انہیں میرا خیال آئے۔ یہی پریشانی میرے نانا کی موت کا سبب بنی تھی اور اس کی وجہ بھی آپ

ہے۔"

میں نے چونکہ انگریزی میں کہا تھا، اسی لیے اس کے ساتھ موجود لڑکی "اوکے" میں تمہارا باہر دیت کر رہی ہوں، "کہہ کر وہاں سے چلی گئی۔"

صارم نے شفر سے مجھے دیکھا۔ "جی۔ کیا بات کرنی ہے آپ کو؟" اس کا انداز اکھڑا اکھڑا سا تھا۔

"میں مومو کے متعلق پوچھنا چاہتا ہوں۔ وہ کیسی ہے؟" ہم دونوں ایک ساتھ شاب سے باہر نکلے تھے۔ وہ میری جانب دیکھنے کے بجائے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔

"کیسا ہونا چاہیے؟" اس نے النامیج سے پوچھا۔ ہم دونوں روڈ کے کنارے پر کھڑے تھے۔

"شادی کر لی اس نے؟ شاید نہیں کی، کیونکہ تمہارے ساتھ تو کوئی اور لڑکی ہے۔" میں نے طنز کیا۔

اس نے چہرہ میری جانب کیا۔ "وہ میری منگیتر ہے، نہیں۔"

"زبردست صارم، بہت اچھا۔ میرا گھر برباد کر کے تمہارے منگیتی رچالی کسی اور سے؟ تمہارے لیے مومو نے مجھے چھوڑا اور تمہیں! مجھے اس پر شدید غصہ آیا تھا۔"

"سب سے پہلے تو حسان صاحب آپ اپنی یہ غلط فہمی دور کر لیں میرے آپ کو چھوڑا تھا۔ انہوں نے آپ کو چھوڑا نہیں تھا، آپ نے ان کو گھر سے دھکے دے کر نکالا تھا۔ اور دوسری بات۔ وہ سرد اور کشیلے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"مجھے اپنے گھر کی بربادی کا ذمہ دار نہ سرائیں۔ آپ نے خود اپنا گھر برباد کیا تھا۔"

"میں نے؟" میں نے بے یقینی سے اپنی جانب اشارہ کیا۔ "میں نے اپنا گھر برباد کیا تھا یا تمہارے؟"

"آپ نے۔ آپ نے اپنے ہاتھوں سے اپنے گھر کو آگ لگائی تھی۔" وہ بڑے سکون سے کہہ رہا تھا۔

"اور تمہارا کوئی دوش نہیں؟"

اس نے ایک جھٹکے سے میری جانب دیکھا "کیوں؟"

میں نے کیا کیا ہے؟

"تم نے میری بیوی کے ساتھ میرے گھر میں افسیر چلایا، صارم! تمہارے میری اس بیوی کو مجھ سے چھین لیا جس سے میں نے جو تیس برس محبت کی تھی۔ اور تم کہتے ہوئے تم نے کیا کیا؟" شدت ضبط سے میری آواز کپکپا رہی تھی۔

کر سکتی تھیں۔ مگر قدرت نے محبت سے تخلیق کیا تھا۔ انہوں نے اپنے ہر رشتہ کو پوری محبت اور خیال سے نبھایا تھا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اپنے بیٹے کو بھول جائیں۔ وہ اپنی پہلی شادی کو بھی اپنی غلطی سمجھتی تھیں احساس جرم اور آپ سے محبت کی اس کشمکش میں وہ دوسرا بچہ پیدا نہیں کرنا چاہتی تھیں اور شاید اپنے بچے کو ممتا سے محروم رکھنے کے جرم میں وہ خود کو سزا دے رہی تھیں۔ پھر انہیں یہ خدشہ بھی ستاتا تھا دوبارہ ماں بننے کے عمل میں کہیں یہ راز نہ کھل جائے کہ وہ پہلے بھی ماں بن چکی ہیں۔ اگرچہ بین آئی انہیں بہت سمجھاتی تھیں لیکن میری ماں کے دل میں ڈر تھا، خوف تھا اس محبت کے کھوجانے کا خوف جو اس نے بہت کڑی ریاضت کے بعد پائی تھی، میری ماں ڈرتی بہت تھی۔ صرف اسی ڈر خوف کے پیچھے، صرف اپنا گھر بچانے کی خاطر انہوں نے اپنی ماستا قربان کر ڈالی۔ انہوں نے مجھے خود سے دور رکھا۔

وہ وہیں گھاس پر بیٹھ گیا تھا۔ وہ رو رہا تھا، وہ بچوں کی طرح رو رہا تھا۔

”سترہ برس میں بن ماں باب کے اپنے تائی کے پاس پلٹا رہا، سترہ برس میں اپنی ماں کو یاد کر کے رو تا رہا اور وہ بھی پرسکون نہیں تھیں۔ وہ ہر دوسرے بچے میں اپنا صارم ڈھونڈتی تھیں، وہ صارم جسے وہ دوتا، بلکنا، ٹور، ٹوٹا، چھوڑ کر تکی تھیں۔ صرف اور صرف آپ کی خاطر۔ آپ کی وجہ سے میں سترہ برس اپنی ماں سے دور رہا۔ وہ سمجھتی تھیں کہ آپ کی محبت انہیں صارم کو اپنے بیٹے کو بھولنے پر مجبور کر دے گی مگر ماں کی ممتا کوئی نعم البدل نہیں ہوا کرتا، وہ آپ کی محبت کے باوجود اپنی ممتا کے آگے ہار گئی تھیں۔“

صارم نے اپنا سر لمب پوسٹ کے ڈنڈے سے ٹکادیا۔ اس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہ رہے تھے۔

”پھر انہوں نے مجھے بلوایا۔ سترہ برس بعد صرف اور صرف ایک ماہ کے لیے میں ان سے ملنے آیا۔ وہ میں پنتیس دن ان کی زندگی کے خوشگوار ترین دن تھے۔ ان کا جوان بیٹا، جو ان کے کندھے سے بھی اونچا تھا، ان کے پاس آیا تھا۔ وہ کیوں نہ خوش ہوتی؟

چونتیس برس انہوں نے آپ کی خدمت کی حسان صاحبہ اور پھر چونتیس برس بعد صرف چونتیس دن اپنے بیٹے کو پیار دینا چاہا، مگر آپ اتنے تنگ دل، خود غرض اور گھٹیا انسان تھے، آپ نے اس پر بھی شک کیا۔ اللہ اور رسول صل اللہ علیہ وسلم کی محبت کے بعد جس تیسری

محبت کو اس دنیا کی سب سے عظیم اور خالص محبت کہا جاتا ہے، جس نے اللہ اپنی محبت کا موازنہ کرتا ہے، آپ نے اس محبت پر بھی شک کیا۔

صرف آپ کی وجہ سے میں ان کو بھی ”ماں“ نہیں کہہ سکا۔ صرف آپ کی وجہ سے میں سترہ برس محرومیوں میں گھرا رہا۔ سترہ برس بعد مجھے میری ماں ملی تھی، مگر آپ نے کیا کیا؟ سب کچھ تباہ کر ڈالا۔“

وہ سر گھٹنوں پر رکھ کر ہچکیوں سے رو رہا تھا، اور میں۔ میں۔ ساکت سا کھڑا اس اونچے لمبے لڑکے کو روتے دیکھ رہا تھا۔ میرے جسم سے کوئی آہستہ آہستہ جان نکال رہا تھا۔

”مومو نے۔۔۔ کیوں نہیں بتایا یہ سب مجھے؟ صرف ایک بار تو اعتبار کیا ہوتا، مجھ پر ایک بار تو کہا ہوتا کہ اس کا بیٹا بھی ہے، کیا تب میں اس کے بیٹے کو اپنا بیٹا سمجھ کر نہ پالتا؟“ میری آواز دور کہیں کسی کھائی سے آتی سنائی دے رہی تھی۔

”ہاں!“ صارم نے تنفر سے سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔ ”میں نے بھی یہی کہا تھا ان سے، جب آپ نے ان کو نکال دیا تھا۔“

اور جانتے ہیں، انہوں نے آگے سے کیا کہا؟ انہوں نے کہا۔ ”صارم! کم نہ بھی ہوتے تب بھی حسان مجھے مجرم ثابت کر ہی دیتے، میں انہیں اپنے پہلے شوہر کا بیٹا ہی تو وہ اٹھتے بیٹھے اس کے نام کے طعنے دیتے، میں سوچ میں گم ہوتی تو وہ مجھ پر اپنے سابقہ شوہر کو یاد کرنے کا شک کرتے۔ شک اس آدمی کی رگ رگ میں بھرا ہے۔“ اور آپ کہتے ہیں، وہ آپ پر اعتبار کرتی؟ انہوں نے تو آپ پر بہت اعتبار کیا تھا، بس آپ نے ان پر نہیں کیا تھا۔

جس دن آپ نے ان کو اپنے گھر سے نکل دیا، اس رات وہ میرے کندھے سے لگ کر بہت روئی تھیں اور میں۔ میں ان کے ساتھ رویا تھا۔ وہ بار بار مجھ سے کہتی تھیں۔

”صارم! مجھے جگادو میں نے شاید کوئی خواب دیکھا ہے۔“ وہ اپنے چہرے پر ہاتھ لگا کر روتی تھیں۔

”صارم! حسان نے میرے منہ پر پوسٹ مارا۔“ وہ اپنے زخمی ہاتھ دیکھ کر روئی تھیں۔ ”انہوں نے میرے ہاتھ دروازے میں کچل ڈالے۔ وہ تو میرے آرٹسٹک ہاتھوں سے بہت محبت کرتے تھے۔ مجھے کاٹا بھی چھہ جاتا، تو تکلیف انہیں ہوتی تھی۔ پھر انہوں نے

کیا کر دیا۔“

اس رات میری ماں بہت روئی تھی، اور اس رات مجھے پہلی بار آپ سے بے حد نفرت محسوس ہوئی تھی۔ میرا دل آپ کو قتل کرنے کو چاہتا تھا۔

صارم روتے ہوئے، بچوں کی طرح روتے ہوئے کہہ رہا تھا، اور کوئی مجھے دودھاری ٹکڑا سے ذبح کر رہا تھا۔

یہ میں نے کیا کر ڈالا؟ میرے خدا! یہ میں نے کیا کر ڈالا؟

میں نے اپنی مومو کو اپنے گھر سے نکال دیا؟ اس مومو کو جس کے لیے میں کتابیں لاتا تھا، جس کے ساتھ میں کافی پیتا تھا، جس کے رنگوں اور تیلیوں سے میں محبت کرتا تھا۔ میرے اللہ! میں نے اس مڑی ہوئی پلکوں والی لڑکی کے ساتھ کیا کر ڈالا؟

سترہ برس بعد اسے اس کا بیٹا ملا تھا، اور میں نے اس کو کیا سزا دے ڈالی؟ میں نے اس کے چہرے پر اپنا بھاری جوتا مارا، وہ جو اس کی پلکوں سے بھی تولگا ہو گا، اس کی ان پلکوں سے جن سے مجھے محبت تھی۔

میں نے اس کے ہاتھ لہولہاں کر ڈالے، وہ ہاتھ جن کو میں دنیا کے خوبصورت ترین ہاتھ کہا کرتا تھا۔ میں نے اس کو ایک دفعہ پھر رولایا، یہ کیا کر دیا میں نے؟

اپنی خود ساختہ تھیوریوں میں، اپنی فضول سوچوں سے میں نے اپنے آئین کو جلا ڈالا؟ یہ کیا کر دیا میں نے؟

”آپ نے مجھ سے میری ماں چھین لی حسان صاحب! اب آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟“

وہ سرخ، گلی آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ میں اسے کیا جواب دیتا، میرے پاس کہنے کو کچھ بھی تو نہیں تھا۔

”صارم! مجھے اپنی ماں کے پاس لے چلو۔ میں۔ میں اس سے معافی مانگ لوں گا۔۔۔ وہ مجھ سے۔۔۔ عیاذ نہیں ہو سکتی۔۔۔ وہ کبھی مجھ پر ناراض نہیں ہوئی۔“

میں گھٹنوں کے بل زمین پر گر گیا تھا۔ میرے ہاتھ صارم کے آگے جڑے تھے۔

”سوری حسان صاحب! اب آپ کو دیر ہو چکی ہے۔ اب آپ کو روز حشر اپنے کیے کا جواب دینا ہو گا۔ میری ماں دو سال پہلے تھائی راز گلینڈ کے کینسر سے مر گئی۔ آپریشن کے دوران ان کی تھائی راز کے پیچھے والی رگ کٹ گئی تھی، نہ بھی کٹتی تو بھی اندر سے تو آپ نے انہیں مار ہی ڈالا

تھا۔“

اس نے بے حد نفرت بھری نگاہ مجھ پر ڈالی۔ ”آپ جو خود کو بہت ذہین سمجھتے تھے، ایک ماں کی محبت کو نہ پہچان سکے مگر آپ بھی کیسے پہچانتے، آپ نے ماں کی محبت دیکھی کب تھی؟“

میں گھٹنوں کے بل گھاس پر بیٹھا ہوں، اور صارم۔ صارم جا چکا ہے۔

میں یہی بتانا چاہتا تھا آپ کو۔ مجھے میرا علم مجھے دھوکا دے گیا تھا۔ کتابوں میں لکھی ساری باتیں سچ نہیں ہوتیں۔ صرف علم کا سارا بہت کمزور سارا ہوتا ہے۔ کتابوں میں جو تھوڑیاں ہوتی ہیں۔ انہیں جیتے جاگتے انسانوں پر ایلائی کرنا کتنا غلط ہوتا ہے۔ ہم ایک جہاں کا علم حاصل کر لیتے ہیں۔ دنیا بھر کی کتابیں پڑھ لیتے ہیں لیکن ایک انسان کو نہیں جان پاتے اسے نہیں سمجھ پاتے۔

میں یہی بتانا چاہتا تھا آپ کو کہ اس دنیا میں فلسفی اور افسانوی روائس بھری جذباتی کشش جسے آپ اور میرے جیسے لوگ محبت کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی ایک محبت ہوتی ہے۔ وہ محبت جس کا مقام اس دنیا کے تمام رشتوں میں پائی جانے والی محبت سے ارفع ہے، وہ محبت ماں کی محبت ہوتی ہے اور میں وہ بد قسمت انسان ہوں جو کسی بھی محبت کو نہیں پہچان سکا۔ پہچانتا بھی کیسے ماں کی محبت تو دیکھی ہی نہیں تھی، تھیوریوں پر یقین کر کے میں مومو کی محبت پر بھی یقین نہیں کرتا تھا۔

اور اب۔ صارم میرے پاس سے جا چکا ہے، جاتے ہوئے وہ کہہ کر گیا ہے کہ جس مومو کے بارے میں آپ کو فخر تھا کہ وہ آپ کے پکارنے سے پہلے ہی آجاتی تھی، آج آپ اس کو جتنا پکاریں گے، وہ نہیں آئے گی۔

تیسری مومو، بھی اسی بیماری سے مر گئی، جس سے کئی برس پہلے ایک اور مومو مر گئی تھی۔

میں جس نے کبھی مومو کو نہیں منایا، آج نور ٹوکی اس مصروف سڑک کے کنارے، گھاس پر گھٹنوں کے بل بیٹھا یہ سوچ رہا ہوں کہ میں اس لڑکی کو کیسے منانے کی کوشش میں نے چونتیس برس محبت کی؟

میں اپنی مومو، حیدر کی مہر النساء اور صارم کی مہر کو کیسے پکاروں؟ اسے کہاں ڈھونڈوں؟